بگولے

احمد ندیم قاسمی

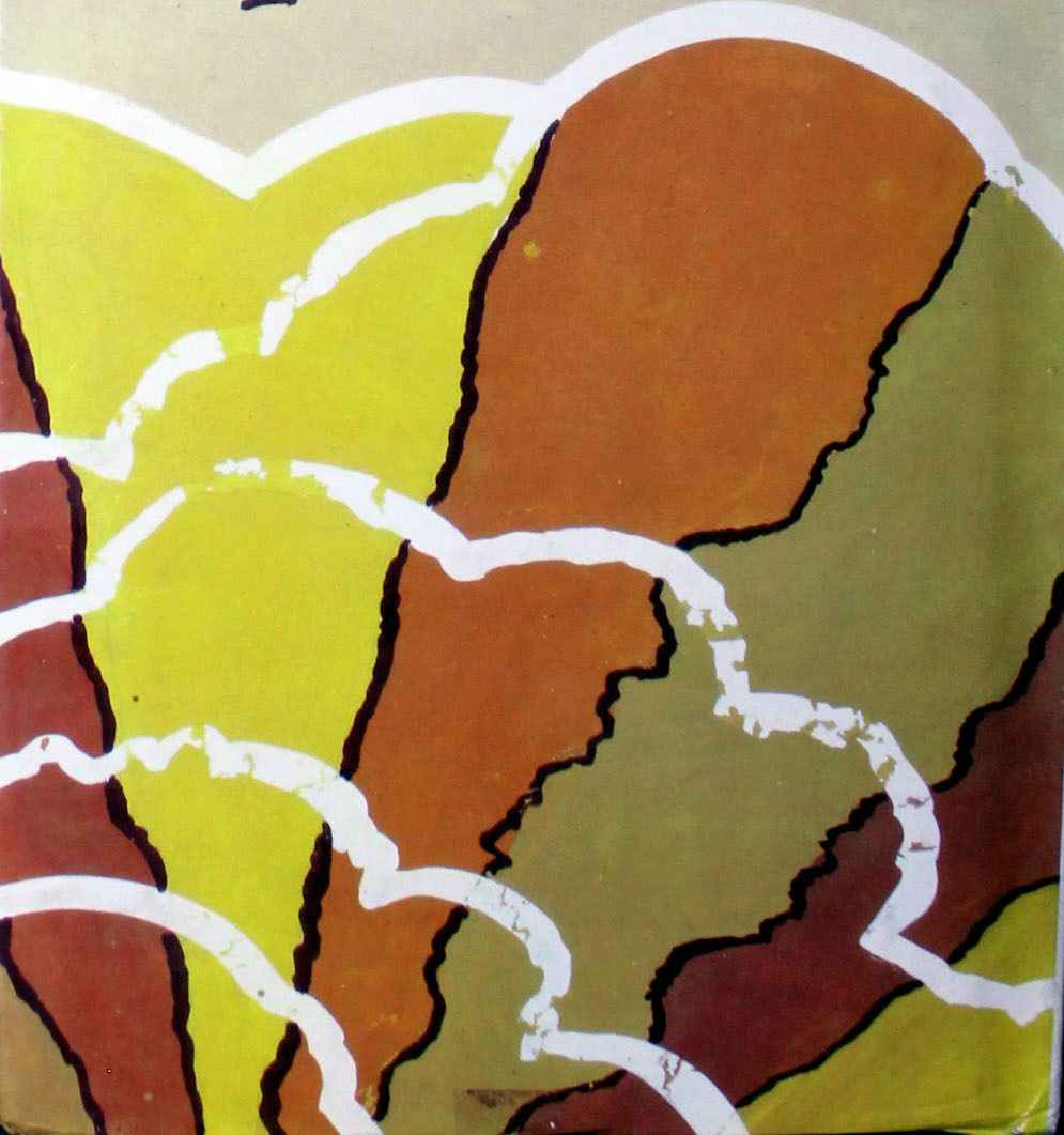

www.iqbalkalmati.blogspot.com

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

بگولے

Sargodha Road Gujrat
Lover's
Library
Book No:
Incharge: Ahmad Raza

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بگولے

(افسانے)

احمد ندیم قاسمی

Sargodha Road
Lover's
Library

اساطیر لاہور

www.iqbalkalmati.blogspot.com

جملہ حقوق محفوظ

کتاب	بگولے (افسانے)
مصنف	احمد ندیم قاسمی
اہتمام	منصورہ احمد (اساطیر)
کمپوزنگ	فراز کمپوزنگ سنٹر' اردو بازار لاہور
سرورق	شاہنواز زیدی
مطبع	شرکت پرنٹنگ پریس نسبت روڈ لاہور
سنہ اشاعت	1995ء
تعداد	ایک ہزار
قیمت	180 روپے

ناشر

اساطیر 45 اے مزنگ روڈ' لاہور

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ترتیب

1	دیباچہ۔ کرشن چندر	11
2	طلائی مہر	21
3	توبہ میری	34
4	بھوت	45
5	ننھے نے سلیٹ خریدی	54
6	بچپنہ	63
7	ماں	77
8	کریا کرم	90
9	بچے	101

www.iqbalkalmati.blogspot.com

10	میرا رانجھا	114
11	چوری	131
12	کھیل	140
13	پاؤں کا کانٹا	150
14	ان بن	160
15	قلی	171
16	السلام علیکم	185
17	خوش رہو	197
18	سپنوں کا محل	208
19	مانوں کی میاؤں	216
20	سرخ ٹوپی	228
21	پرچھائیاں	238

www.iqbalkalmati.blogspot.com

نذر

برادرِ بزرگ پیرزادہ محمد بخش صاحب قاسمی

کے نام

جنھوں نے میرے بچپن کی نیم شگفتہ، نیم پژمردہ گھڑیوں، سنِ بلوغ کے احساس کی آنچ سے تپتے لمحوں اور شباب کی دھڑکتی اور بھڑکتی ساعتوں میں متبسّم چہرے اور پرخلوص ولولے سے میرا ساتھ دیا اور بارہا مجھے ناامیدی اور تذبذب کے غاروں میں گرنے سے بچایا۔

ندیم

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بگولے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

دیباچہ

ہندوستان اپنے دیہاتوں میں رہتا ہے۔ ہندوستان کے شہروں کے مسائل دوسرے ملکوں کے بڑے بڑے شہروں کے مسائل سے کچھ زیادہ مختلف نہیں۔ ان میں ایک ایسی ہمواری اور یگانگت پائی جاتی ہے کہ ہر ملک کا افسانہ نویس کم و بیش تھوڑے سے تجربے کے بعد ان پر قلم اٹھا سکتا ہے۔ لیکن اگر اس ہندوستان کی تصویر دیکھنا ہو جو دیہاتوں میں بستا ہے تو ایسی تصویر غیر ملکی ادیبوں کے ہاں تو کیا اپنے ہاں بھی بہت کم ملے گی۔ پڑھے لکھے لوگ عموماً شہروں کی پیداوار ہیں اور شہری زندگی ہی سے زیادہ دلچسپی رکھتے ہیں۔ ان میں سے اکثر یہ بھی نہیں جانتے کہ گیہوں کا پودا کتنا بڑا ہوتا ہے۔ آک کی جھاڑیوں کے پتے کیسے ہوتے ہیں۔ ہل کیسے چلایا جاتا ہے' نلائی کسے کہتے ہیں۔ اسی لیے تو جب کوئی ایسا پڑھا لکھا شہری افسانہ نویس دیہات کی زندگی کے متعلق افسانے لکھنے بیٹھتا ہے تو عام طور پر ایسے خاکے تیار کرتا ہے جنہیں ذہنی' نفسیاتی اور مقامی اعتبار سے دیہاتی زندگی سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اردو زبان میں ہندوستان کی دیہاتی زندگی کے متعلق صحیح اور جامع مرقعے سب سے پہلے منشی پریم چند آنجہانی نے ترتیب دیئے اور موجودہ دور میں جن ادیبوں نے دیہات کے موضوع

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کو نہایت کامیابی سے اپنایا ہے اور اس پر ذاتی تجربے' صحیح ادراک' اور ذہنی دیانتداری کے ساتھ قلم اٹھایا ہے' ان میں احمد ندیم قاسمی کا نام پیش پیش ہے۔

احمد ندیم قاسمی ان معدودے چند ادیبوں میں سے ہیں۔ جو خود دیہاتی ہیں' جن کی حساس افتادِ طبع نے انہیں اپنے گردو پیش کے حالات کا بنظر غائر مطالعہ کرنے پر مجبور کیا ہے اور جو اب بھی اپنی زندگی کا بیشتر حصہ ان کسانوں اور مزدوروں کے ساتھ بسر کرتے ہیں' جنہیں عام طور پر ہندوستان کی ریڑھ کی ہڈی کہا جاتا ہے۔ (گو مجھے اس میں شبہ ہے کہ ہندوستان بیچارے کی کوئی ریڑھ کی ہڈی بھی ہے اور جیسا کہ آپ کو ابھی ان افسانوں کے مطالعہ سے معلوم ہو جائے گا.......)

قاسمی کے افسانوں میں پنجاب کے دیہاتوں کا مقامی رنگ ہے اور وہ بھی کوہستان نمک کے دیہاتوں کا مقامی رنگ۔ کوہستان نمک پنجاب کے شمال میں ایک ٹیڑھی میڑھی سطح مرتفع ہے۔ چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں' اپنے دامن میں پتلی پتلی ندیوں اور سرسبز چراگاہوں کو لیے' خوبصورت گاؤں' سرخ یا سپید مٹی سے لپے ہوئے' درخت' پھول اور جھاڑیاں تقریباً وہی جو وسطی اور غربی پنجاب میں ہیں' یعنی شریں' نیم' ببول' بیری اور شیشم' ہاں گھاس زیادہ لمبی اور سبز ہوتی ہے' اور بھیکڑ کی جھاڑیاں بافراط پائی جاتی ہیں۔ زبان پھوٹوہاری پنجابی سے ملتی جلتی ہے جس کی شیرینی ضرب المثل ہے۔ کوہستان نمک کا سلسلہ ایک طرف تو کشمیر سے جا ملتا ہے اور دوسری طرف صوبہ سرحد سے' اسی لیے یہاں کے لوگ خوبصورت بھی ہیں اور غیور بھی۔ ہندوستانی فوجیوں کی کثیر تعداد اسی علاقہ سے بھرتی کی جاتی ہے۔ اس کی سطح مرتفع اور اس کی ننھی ننھی وادیوں میں احمد ندیم قاسمی نے اپنے رنگین اور دلاویز افسانے سجائے ہیں۔

لیکن یہ افسانے محض مقامی رنگ کے افسانے نہیں۔ احمد ندیم قاسمی خالی خولی فوٹوگرافی سے کام نہیں لیتے بلکہ ایک چابکدست فنکار کی طرح اس

www.iqbalkalmati.blogspot.com

مقامی رنگ کو اپنے افسانوں کا پس منظر بنا کر اس کے تانے بانے پر دیہاتی زندگی کے جاندار مرقعے تیار کرتے ہیں۔ یہ ایسے مرقعے ہیں جن میں دیہاتی زندگی کو مختلف النوع پہلوؤں سے دیکھا گیا ہے۔ دیہاتیوں کی سادہ لوحی اور ان کی ظالمانہ رسوم پرستی' محبت اور پیٹ کی پیکار' بھوک اور عزت کا تضاد' مردوں کی بربریت اور عورتوں کی غلامانہ ذہنیت' کوہستانی دوشیزہ کا مثالی حسن' اور پھر اس مثالی حسن کی فروخت چند روپہلی ٹکلیوں کے عوض' وہ روپہلی ٹکلیاں جن سے لگان ادا ہو سکتا ہے' زمین رہن ہونے سے بچ سکتی ہے اور زندگی اپنی تمام ترصعوبتوں اور مسرتوں کے ساتھ جاری رہ سکتی ہے۔ کشمکشِ حیات اپنی بنیادی سچائی کے ساتھ ان افسانوں میں جلوہ گر ہے۔ ان افسانوں میں احمد ندیم قاسمی زندگی سے گریز کرتا نظر نہیں آتا' بلکہ اسے چھو لینے کے لیے بے قرار دکھائی دیتا ہے۔

احمد ندیم قاسمی کا فکری نظریہ ترقی پسند ادیبوں کے بہت قریب ہے لیکن احمد ندیم قاسمی ان ادیبوں میں سے نہیں' جنھوں نے آج تک کسی کسان کا گھر نہیں دیکھا' جو اس کی بولی ٹھولی' رسم و رواج اور رہن سہن کے طور طریقوں سے بھی آگاہ نہیں' جس کے متعلق ان کا منبعِ علم' معاشیات کی چند درسی کتابوں یا اپنے رہنماؤں کی جذباتی تقریروں تک محدود ہے اور جو یونہی کبھی کبھی ایک سطحی جوش کے زیرِ اثر کسان کی جبین کے پسینے اور اس کی مظلوم عورت کے سوگوار حسن کے متعلق شاعری کیا کرتے ہیں۔ ایسے ادیب بھی اپنی جگہ قابلِ قدر ہیں۔ اس لیے کہ وہ ترقی پسند ادب کے دائرے کو وسیع کرتے ہیں۔ لیکن جہاں تک فنی صداقت اور شدتِ تاثر کا تعلق ہے' احمد ندیم قاسمی کا درجہ ان لوگوں سے بہت بلند ہے اور اس کے ادبی تجربے ہمارے لیے زیادہ وقعت رکھتے ہیں۔ احمد ندیم قاسمی خود ایک کسان ہے۔ اسے کسانوں کی زندگی سے کماحقہ' واقفیت ہے۔ اور اس کے فکری شعور میں نفسیاتی تضاد' نیم بورژ

www.iqbalkalmati.blogspot.com

وائی کشمکش اور رجعتی میلانات بہت کم ہیں، جن سے متوسط طبقے کے شہری ادیبوں یا اس سے اونچے طبقے کے ادیبوں کو ترقی پسند ادیب بننے کے لیے جنگ کرنا پڑتی ہے۔ موخر الذکر ادیبوں کو اکثر اوقات ان کا آبائی اور معاشرتی ماحول اور ان کے جماعتی مفاد کا شعوری یا غیر شعوری احساس ایک تنگ ادبی دائرے میں محصور کر دیتا ہے اور وہ عموماً اس دائرے کو توڑ کر آگے نہیں بڑھ سکتے۔ یا اپنی بہترین ادبی کاوشیں اسی معیار کو توڑنے اور سر کرنے میں صرف کر دیتے ہیں۔ لیکن احمد ندیم قاسمی کے لیے کوئی ایسا دائرہ نہیں، کوئی ایسا دوراہا نہیں کہ جو بقول گوپال متّل اسے تذبذب میں ڈال دے۔ "دوراہے پہ ہے کارواں زندگی کا۔" وہ یہ نہیں سوچتا کہ "میں اِس سمت جاؤں کہ اُس سمت جاؤں؟" وہ جمہور سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کی ابدی تخلیق کی سمت متعین ہو چکی ہے۔ اس کے نفسیاتی شعور نے اپنے افسانوں میں ایک فکری رہگذر بنا ڈالی ہے جس پر وہ بے کھٹکے، بے دریغ آگے بڑھتا جاتا ہے۔ دوسرے طبقوں کے ادیبوں کی طرح نہ اس کے دل میں تذبذب ہے، نہ دو مختلف جماعتی مفادات کی پکار، نہ اس راستے سے پیچھے مڑ جانے کی تمنا۔ دوسرے طبقوں کے ادیبوں کو، اگر وہ حقیقی اور بنیادی طور پر ترقی پسند ادب کی فکری اساس کو قبول کر کے اس راہ پر چلنا چاہتے ہیں، بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ انہیں اپنی جماعت سے، اپنے آپ سے نفرت کرنا پڑتی ہے۔ (اور یہ میں ذاتی تجربے کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ اپنی جماعت اور اپنے آپ سے نفرت کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے) لیکن احمد ندیم قاسمی کی زیرِ نفسی کیفیات اور واردات قلب ان الجھنوں کی حامل نہیں۔ دوسرے طبقوں کے ترقی پسند ادیبوں کی تخلیقات اپنے آپ اور اپنی جماعت سے نفرت پر شروع ہوتی ہے اور آہستہ آہستہ کسانوں یا مزدوروں کی محبت پر منتج ہوتی ہے۔ لیکن احمد ندیم قاسمی کو ترقی پسند ادیب بننے میں ایسے کسی عملِ معکوس (Reverse Process) سے کام نہیں لینا پڑتا۔ وہ

www.iqbalkalmati.blogspot.com

فطری طور پر ترقی پسند ادیب ہے۔ وہ اپنی جماعت سے، اپنے آپ سے نفرت نہیں کرتا، محبت کرتا ہے۔ قاسمی کے دل میں دوسرے طبقے کے ادیبوں کی طرح کسانوں کے لیے جذبۂ ترحم نہیں ہے۔ یہ تو ایک خالص بورژوائی جذبہ ہے۔ اس کی "انا" اور اس کے جماعتی مفاد اسے خود بخود کسانوں کی ترجمانی کرنا سکھاتے ہیں۔ (اور یہ وہ چیز ہے جو ہمارے ہاں بہت کم ادیبوں کو نصیب ہے) اس زندگی میں کئی صعوبتیں ہیں، کئی مسرتیں ہیں، پٹواری، نمبردار، بنیا، پولیس، یہ سب کسان کی زندگی کا لازمہ ہیں اور احمد ندیم قاسمی کے افسانوں میں بار بار آتے ہیں۔ لیکن ان مختلف اجزائے افسانہ کی ترتیب اور تناسب اس قدر صحیح ہے کہ یہ افسانے کسانوں کی زندگی کے بہترین عکاس اور ان کے سماج، معاشرت، رسم و رواج اور گوناگوں جذبات اور ذہنی کیفیات کے جیتے جاگتے مرقعے بن جاتے ہیں۔

"چوپال" کے بعد "بگولے" اس افسانوی رہگذار پر سنگ میل ہے جو ہمیں احمد ندیم قاسمی کے ذہنی ارتقاء کو ماپنے میں مدد دیتا ہے۔ چوپال میں شیرینی اور رنگینی ہے۔ عشق سادہ کی خامکاریاں، دہقانی زندگی کے خوش آئند لمحے لیکن "بگولے" میں، جیسا کہ نام سے بھی ظاہر ہے، اک کربناک فکری تلخی اور صحرائی وحشت پائی جاتی ہے۔ اس کی انتہائی مثال اسی مجموعے کی ایک کہانی "السلام علیکم" میں مل سکتی ہے۔ جب امیر خان جنگ عظیم کے بعد اپنے دل میں ارمانوں کی دنیا آباد کیے ہوئے اپنے گاؤں کو واپس آتا ہے اور صبح کاذب کے مٹتے ہوئے اندھیارے میں اپنی بیوی کو کسی غیر مرد کے ساتھ مصروف اختلاط پاتا ہے اور بعد میں اسی افسانے کے اختتام پر جب وہ اپنی بیوی کی عصمت پر ہاتھ ڈالنے والے کے منہ سے "السلام علیکم" کے مقدس الفاظ سنتا ہے تو پڑھنے والے کو یہ معلوم ہوتا ہے یہ مقدس الفاظ اس سوئے ہوئے گاؤں میں اک غول بیابانی کا نعرہ بن گئے ہیں۔ یہ گاؤں سیدھے سادھے دیہاتیوں کا گاؤں نہیں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

رہا۔ بلکہ جنات کی بستی اور بھوتوں پریتوں اور چڑیلوں کا مسکن۔

"بگولے" میں احمد ندیم قاسمی نے کسانوں کی دنیا کا مختلف جہت سے مطالعہ کیا ہے۔ ان افسانوں میں اس کا فکری شعور، ذہنی ادراک اور گردوپیش کا ماحول باہم منطبق نظر آتے ہیں اور یہی چیز فن کار کو افسانوی طور پر کامیاب بناتی ہے۔

چوپال میں محبت کے زیادہ دلکش پہلوؤں کو اجاگر کیا گیا ہے (وہ محبت جسے پچاس سال سے زیادہ عمر رکھنے والے ادیب "شبابیات" کا نام دے کر ایک خاص قسم کی طنزیہ مسرت محسوس کیا کرتے ہیں، بیچارے!) لیکن "بگولے" میں اکثر افسانے محبت اور سماج، محبت اور روزگار، محبت اور حکومت کی کش مکش کے آئینہ دار ہیں۔ کسی طرح سماج اور روزگار اور حکومت، یہ تینوں معاشرتی ادارے اکثر محبت کا گلا گھونٹ دینے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ یا اگر کامیاب نہیں ہوتے تو اسے گزند پہنچا کر اس کی شدت اور اس کے تاثر کے دائرے کو محدود کر دیتے ہیں۔ "میرا رانجھا" میں امامی کا محبوب امامی سے اس لیے منہ موڑ لیتا ہے کہ خوب صورت امامی اپنے ماں باپ کی جائز اولاد نہیں، اس پر سماج کے جنسی قوانین کی صالح مہر موجود نہیں۔

"طلائی مہر" میں فیض اور سونی کی الفت کے درمیان ایک تھانیدار کی نخوت اور حکومت کا استیصال، اور پھر وہ طلائی مہر ہے، جسے اپنے خونیں سینے سے چمٹائے ہوئے وہ کہانی کے آخر میں اپنی محبوب کے پاس جاتا ہے۔ فیض نے اپنی تمام مشکلات پر قابو پالیا۔ لیکن یہاں افسانہ نگار کا حقیقی مقصد اس آدرشی فتح کو دکھانا نہیں بلکہ ان مشکلات کو بیان کرنا ہے کہ جن سے ایک غریب کسان کی شخصی محبت مجروح کی جاتی ہے۔ "توبہ میری" میں کریم خاں کی موت اس لیے نہیں ہوتی کہ اس کا کلیجہ بھوت پریتوں نے کھا لیا ہے۔ اس کا کلیجہ کھا جانے والے وہ لوگ ہیں جو استعداد رکھتے ہوئے بھی اس کی بیماری کے دنوں میں اسکی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہمدرد نہیں کرتے۔ سماج کا وہ چکر ہے جو اسے بیماری کی حالت میں "ملک جی" کے کام کے لیے چھکڑا چلانے پر مجبور کر دیتا ہے۔ راستے میں اسے سردی لگ جاتی ہے اور وہ اپنے چھکڑے پر بیٹھا بیٹھا جاں بحق ہو جاتا ہے۔ یہی وہ سماج کا ظالمانہ چکر ہے جس کے بگولے دیہات کے میدانوں میں اڑتے ہیں' جنھوں نے کسانوں کے گھروں اور چوپالوں کو کھنڈر بنا دیا ہے اور ان میں انسانوں کے بجائے زندہ بھوت اور غول بیابانی آباد کر دیئے ہیں۔ اگر احمد ندیم قاسمی چیخ سکتا تو ہر افسانے کے اختتام پر چلا کر کہتا۔ "بچاؤ' بچاؤ' ہندوستان کے دیہاتوں کو اس خودکشی سے بچاؤ۔" لیکن احمد ندیم قاسمی ایک کسان ہے۔ وہ چیختا نہیں وہ اپنے انتقام کی خاموش آگ اپنے پڑھنے والوں کے دلوں میں منتقل کر دیتا ہے۔ ہاں کبھی کبھی اس کے شعروں میں اس خاموش آگ کے شرارے دمکتے ہوئے نظر آجاتے ہیں۔

جنگ کے دنوں میں جب دیہاتوں میں بھرتی زوروں پر ہوتی ہے اور گاؤں کے گاؤں نوجوانوں سے خالی ہو جاتے ہیں' اس وقت ان خالی دیہاتوں کی سماجی زندگی کا انتشار عجیب اور بے حد دلچسپ ہوتا ہے۔ دلچسپ اور اکثر حالتوں میں المناک بھی۔ پچھلی جنگ عظیم میں جو حالت اکثر فرانسیسی دیہاتوں کی تھی' وہی حالت کم و بیش ہندوستان میں ان دیہاتوں کی بھی تھی جہاں سے سپاہی لوگ بھرتی کیے گئے تھے۔ مثال کے طور پر ایک ایسے دیہات میں لڑکیوں کی تعداد لڑکوں یا مردوں سے بہت زیادہ ہوتی ہے' اور اسی تناسب سے اخلاقی اقدار بھی بدل جاتی ہے۔ عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ جب فوجی محاذ پر لڑ رہے ہوتے ہیں تو ان کے گاؤں میں تقدیس و وفا کی پتلیاں دن رات ان کے نام کی مالا جپنے میں مصروف ہوتی ہیں۔ احمد ندیم قاسمی نے اس ضمن میں ان دو کہانیوں میں جن دلچسپ حقائق کو بیان کیا ہے وہ پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔

"السلام علیکم" میں جب امیر خان جنگ عظیم کے بعد فرانس میں اپنی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

محبوبہ ''لیوسی'' کو الوداع کہہ کر ہندوستان میں اپنے گاؤں واپس آتا ہے' تو اپنی بیوی کو کسی غیر مرد کی ''لیوسی'' بنا ہوا دیکھ کر ششدر رہ جاتا ہے۔ لیکن انسانی فطرت کی کمینگی سے قطع نظر اس میں حیران ہونے کی کونسی بات ہے۔ قدرت کے قوانین مرد اور عورت دونوں کے لیے مساوی ہیں۔ وہ سماج کے قوانین سے زیادہ کڑے اور مضبوط اور ہمہ گیر ہیں۔ وہ ہندی عورتوں پر بھی اسی طرح حاوی ہیں جس طرح فرانسیسی عورتوں پر۔ یہ الگ بات ہے کہ ہم اس ملک کی عورتوں کو دوسرے ملکوں کی عورتوں سے زیادہ پاکباز' زیادہ باعصمت سمجھتے ہیں۔ (لیکن اس جذبے کی تہ میں خوش فہمی' سطحی قومیت اور ایک ذلیل قسم کے احساس کمتری کے سوا اور کچھ نہیں)

دوسری کہانی ''سرخ ٹوپی'' ہے۔ یہ بھی پچھلی جنگ عظیم سے متعلق ہے۔ اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ اپنے سپاہی خاوند کو اس کی نوبیاہتا کس طرح فخر اور احترام کے ملے جلے جذبات کے ساتھ دیکھتی ہے اور گاؤں کی دوسری عورتیں بھی کس طرح اس کی حالت پر رشک کرتی ہیں۔ گاؤں والے اپنے سپاہیوں کے متعلق کبھی یہ خیال نہیں رکھتے کہ وہ ''توپ کا چارہ'' یا ''پیسے کے پٹھو'' ہیں۔ اس قسم کی سیاسی اصطلاحات کو جو ہندوستان کی شہری زندگی میں رائج ہیں' دیہاتوں میں قبول عام حاصل نہیں۔ ایک سپاہی اپنے دیہات کے لیے باعث افتخار ہے۔ اسی لیے تو جب گاموں کا نام فوج سے کٹ جاتا ہے اور وہ اپنے گھر کے آنگن میں آکر نمبردار کے خلاف زہر اگلتا ہے جس نے اس کے خلاف رپورٹ کر کے اس کی نوکری چھڑوا دی تو اس کی نوبیاہتا مغموم اور شرمندہ سی ہو جاتی ہے۔ اور نمبردار نے گاموں کے خلاف کیوں رپورٹ کی؟ اس لیے کہ گاموں شہری مسلمانوں کی تقلید میں سرخ رنگ کی ترکی ٹوپی پہنا کرتا تھا۔ شہری مسلمان اس پر ہنسیں گے' لیکن بعض اوقات حقیقت سرخ رنگ کی ترکی ٹوپی سے زیادہ سرخ اور خونیں ہوتی ہے اور معصوم گاموں اور اس کے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

خلاف رپورٹ کرنے والے ہندوستان کے بیشتر دیہاتوں میں پائے جاتے ہیں۔

احمد ندیم قاسمی کا انداز بیان بے حد نرم و نازک اور شیریں ہے۔ اس کے افسانے "سونی" کی طرح خوب صورت ہیں۔ وہ سونی جس کے متعلق اس نے "طلائی مہر" میں یوں لکھا ہے۔

"سونی...... بہت شرمیلی اور سمٹی سمٹی جیسے گلاب کی کلی جو سورج کی روشنی اور گستاخ جھونکوں سے لجائے اور پتوں میں چھپ چھپ جائے...... گلابی پاؤں میں سبز چمڑے کا جوتا' پیلی چھینٹ کا لہنگا' جاپانی اودے ریشم کی قمیض' سر پر تاروں بھری اوڑھنی' ناک میں چاندی کی موتی ایسی کیل' کانوں میں جھمر جھمر کرتے 'بندے جن کے نیچے جیسے شبنم کے قطرے لس لس کرتے رہتے۔ گلے میں ہنسلی جس سے چاندی کے گھنگھرو لٹکے رہتے...... ٹخنوں سے لپٹی ہوئی جھانجھنیں' جو ہر قدم پر ایسا چھناکا پیدا کرتی تھیں جیسے بیشمار کوئلیں نیم کے چھتناروں میں چھپی رک رک کر کو کو پکار رہی ہوں۔"

(طلائی مہر)

لیکن یہ دلاویز خوب صورت افسانے جن میں کسی کوہستانی دوشیزہ کی سی رعنائی اور دلکشی ہے' اپنے نازک سینوں کے زیر و بم میں ایک احتجاجِ پیہم کا طوفانِ عظیم چھپائے ہوئے ہیں۔ اگر آپ ان کی گونج سن سکیں۔ اگر آپ اس خاموش احتجاج سے متاثر ہو کر کسانوں کے لیے اپنے دل میں محبت اور رفاقت کے پاکیزہ جذبات کی تخلیق کر سکیں تو احمد ندیم قاسمی اور اس کے رفقاء کی محنت اکارت نہ جائے گی۔ احمد ندیم قاسمی کسانوں کی زخمی زندگی کا عکاس ہے۔ ان کی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

مجروح محبت کا نمائندہ ہے۔ وہ خود زمین اور انسان سے محبت کرتا ہے اور آپ سے بھی اسی محبت کا طالب ہے۔ آپ کی محبت کے بھروسے پر کسان بہت کچھ کر سکتا ہے۔ وہ اس "طلائی دیوار" کو جو زندگی اور اس کی خوشیوں کے درمیان کھنچی ہوئی ہے، اپنے زخمی سینے کی ابلتی ہوئی طاقت سے شکستہ اور چکنا چور کر سکتا ہے اور فیض اور سونی کی الفت کی طرح پھر زمین اور انسان کا اتصال کرا سکتا ہے۔ وہ اتصال جس کے بغیر انسانی مسرت ممکن نہیں۔

"اور تاروں بھرے آسمان کے بالمقابل جمے ہوئے ٹنڈ منڈ بیریوں کے آبنوسی سایوں نے دیکھا کہ ایک لڑکی جس کے ٹخنوں سے لپٹی ہوئی جھانجھنیں ہر قدم پر ایک دلاویز چھنا کا پیدا کرتی ہیں، جس کی ناک میں چاندی کی موتی ایسی کیل ہے، اپنی پیلی چھینٹ کے لہنگے سے اس کے زخم دھو رہی ہے، اور جب فیض کی خون آلود انگلیوں نے ایک طلائی مہر اس کی حنائی انگلیوں میں تھما دی، تو اندھیرا گہرا ہو گیا۔ ستارے ماند پڑ گئے۔ ٹڈیاں اور جھینگر چیخ اٹھے اور ملائم، تپتے ہوئے، بھیگے ہوئے گال ایک زخم خوردہ چوڑی چھاتی پر بہت دیر تک پڑے دھڑکتے رہے۔"

(طلائی مہر)

دہلی

یکم ستمبر ۱۹۴۱ء

کرشن چندر

✿

www.iqbalkalmati.blogspot.com

طلائی مہر

ہڈیاں چٹخیں' پسلیاں چرچرائیں اور سوکھے گلوں سے پژمردہ چیخیں بلند ہوئیں۔ "ایسا کبھی نہیں ہو سکتا!"

اور اب پٹواریوں' جاگیرداروں اور نمبرداروں کے ہجوم میں سے تھانیدار اپنی پگڑی کا زاویہ بدلتے ہوئے نکلا اور کڑکا۔ "ایسا ضرور ہو گا! یہ میرا حکم ہے اور میرا حکم اس علاقے کا قانون ہے۔ مہینہ بھر تم اپنی زمینوں پر ہل نہیں چلا سکتے' نہ تم کھیتوں کی دیکھ بھال کر سکتے ہو' نہ گوبھی کی کیاریوں کو پانی دے سکتے ہو۔ تم نے ڈاکوؤں کو پناہ دے رکھی ہے اور جب تک تم اپنے کیے کی سزا نہ بھگتو گے' تمہارے ہوش ٹھکانے نہیں آئیں گے۔ تم لاتوں کے بھوت ہو!"

ایک پھٹے ہوئے چولے والا نوجوان مجمع چیر کر آگے بڑھا۔ اس کے گلے کی رگیں پھول رہی تھیں' بازوؤں کے پٹھے تن گئے تھے اور رنگ چقندر کی طرح لال تھا۔ وہ تھانیدار کے مقابل جا کر پکارا۔ "لیکن ہم تباہ ہو جائیں گے حضور۔ ہم مر جائیں گے۔ ہم غریب آدمی ہیں!" اور مجمع سے دبی دبی آوازیں'

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"اے فیض، فیض! کیا کرتا ہے، پیچھے ہٹ آ"۔

سامنے سے تھانیدار نہایت تند لہجے میں اس کی ماں اور بہن کی آبروریزی کے ارادے کرتا ہوا دہاڑا۔ "یہ منہ پھٹ چھوکرا کون ہے؟ بدزبان، بے حیا۔ ارے تم غریب ہو تو یہ تمہارے اپنے ماتھے کا لکھا ہے۔ تمہاری غریبی میرے حکم کی راہ میں روڑا بن کر کیوں اٹکے۔ کل شام تک تم سب اپنے جھونپڑے چھوڑ چھاڑ کر گاؤں میں جا بسو۔ پورے ایک مہینے تک نہ ہل چلاؤ، نہ کھیتوں کی دیکھ بھال کرو، نہ گوبھی کو پانی دو۔ ورنہ تم مجھے اچھی طرح جانتے ہو۔ میرے ڈنڈوں کی ضرب اس قدر سخت ہے کہ کئی بدمعاش آج تک ماتھے پر پٹیاں باندھے میرے سائے سے چھپتے پھرتے ہیں۔"

ایک بوڑھا کھوسٹ پرلی طرف سے ایک بیری کے تنے کا سہارا لے کر اٹھتے ہوئے بولا۔ "ہم پر رحم کیجئے۔ ہم پر رحم کیجئے مالک!" اور تھانیدار پلٹ کر جاتے ہوئے ہوئے بولا۔ "میں کیا جانوں رحم کون بلا ہے۔ میں رحم کرنا نہیں جانتا۔ میرا حکم اس علاقے کا قانون ہے!"

اور دور سفید بادل کے سائے میں ایک باز ایک بھٹکے ہوئے نیلے کبوتر پر جھپٹا اور اسے پنجوں میں دبوچ کر نُچے کُچے پر فضا میں بکھیرتا، تھانے کی کالی عمارت کی طرف اڑ گیا!

ان دنوں علاقے میں دو ڈاکو پھر رہے تھے جنہوں نے قرضے کے بوجھ سے تنگ آ کر گاؤں کے ایک سیٹھ کا پیٹ چاک کر دیا اور لمبی لال پوتھیاں جلا دیں۔ کئی بار ایسا ہوا کہ ڈاکو پولیس کی زد میں آ گئے مگر پولیس والوں کو معلوم تھا کہ ان کے پاس سرحد پار کی بندوقیں ہیں اور ان کی بے پناہ نشانہ بازی کے چرچے تو دور دور تک پھیلے ہوئے تھے! وہ ڈاکو کی آمد کی خبر پاتے ہی وردیاں پہننے اور پیٹیاں کسنے لگتے اور ڈاکو اندھیری گھاٹیوں کے گہرے غاروں میں دبک جاتے...... اور پھر اوپر رپورٹ بھیج دی جاتی کہ گاؤں والے ڈاکوؤں کو

www.iqbalkalmati.blogspot.com

چھپائے رکھنے پر متفق ہو گئے ہیں لیکن ان پر مناسب دباؤ ڈالا جا رہا ہے۔ عنقریب انہیں زبردست زک پہنچے گی۔ اور وہ سب راز اگلنے پر مجبور ہو جائیں گے ــــــــ گاؤں پر پچھلے دو مہینوں سے تعزیری چوکی کا دیو بھی مسلط کر دیا گیا تھا اور وہ لوگ جو صبح جو کی روٹی پانی کے ساتھ نگل کر شام کے کھانے کی فکر میں غرق ہو جاتے تھے۔ ہر مہینے کچھ رقم مہیا کرنے پر مجبور کر دیے گئے! اس سلسلے میں اتنا سننے میں آیا کہ ایک بوڑھا اپنی کنواری بیٹی کا رات بھر غائب رہنا صرف اس لیے برداشت کر لیتا کہ صبح سویرے اس کی ڈبڈبائی آنکھوں والی لڑکی اس کی ہتھیلی پر چونی یا اٹھنی رکھ دیتی ہے' اور ایک بڑھیا جس کا خاوند مر گیا تھا اور بیٹا شبے کی بنا پر پھانسی پا چکا تھا' کھاتے پیتے لوگوں کا غلہ پیستی پیستی چکی کے پاٹوں پر سر رکھ کر ٹھنڈی ہو گئی! ــــــــ اور جب اس قدر سختی کے باوجود ڈاکوؤں نے خود بخود تھانے آکر اپنے آپ کو پولیس کے حوالے نہ کیا تو اوپر سے حکم لیا گیا کہ گاؤں سے باہر جو لوگ کھیتوں کے لیے جھونپڑیوں میں رہتے ہیں' ڈاکوؤں کو پناہ دیتے ہیں اس لیے انہیں ہل چلانے' کھیتوں کی دیکھ بھال کرنے اور گوبھی کی کیاریوں کو پانی دینے سے روک دیا جائے تاکہ وہ اس دباؤ سے تنگ آکر سرکار کا ہاتھ بٹا سکیں۔

زمینیں ٹھنڈ سے اکڑ گئیں! کھیت مرجھا گئے! گوبھی کے پھولوں پر گرد جم گئی لیکن حکم حاکم مرگ مفاجات۔ چپ سادھے بیٹھے رہے۔ کبھی کبھی دبے پاؤں اپنے کھیت دیکھنے چلے جاتے۔ مینڈھوں کی خشک گھاس پر جمی ہوئی یخ چادر ان کے پاؤں کے نیچے چٹختی تو ان کے کلیجے کٹ جاتے! اور جب گوبھی کے چوڑے چوڑے پتوں پر زردی بکھری ہوئی دیکھتے تو ان کے روئیں روئیں سے چنگاریاں جھڑنے لگتیں۔

لیکن اس قدر تباہی کے باوجود فیض کی کیاریاں اسی آن بان سے لہلہاتی رہیں۔ اور جب شام کو تاروں بھرے آسمان کے بالمقابل ٹنڈ منڈ بیریوں کے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

آبنوسی سائے جم کر رہ جاتے اور جب جھیل کے اس طرف کوئی بھٹکی ہوئی مرغابی کنارے کی کائی میں گھس کر پھڑ پھڑاتی تو فیض گھر سے باہر نکلتا اور دیواروں سے لگ کر چلتا' جھاڑیوں کے پیچھے دبکتا' آباد راہوں سے کتراتا' اپنے کنویں پر چلا جاتا۔ ٹین کے ڈول سے پانی نکالتا۔گوبھی کی کیاریوں کو لبریز کر کے موٹے موٹے پورے چاند ایسے پھول اکھیڑ کر ایک ٹوکرا بھرتا' اور قصبے کے بوڑھے سبزی فروش کے ہاں پہنچا کر گاؤں لوٹ آتا اور جب جھٹپٹے کے وقت لوگ مسجدوں کی طرف جاتے تو فیض کو اپنی جھکی ہوئی ڈیوڑھی کے اندر بھوری گائے کے اُس طرف ایک موٹا کمبل اوڑھے خراٹے بھرتا پاتے۔

فیض گاؤں بھر میں ایک ہی شرمیلا اور باہمت نوجوان سمجھا جاتا تھا۔ لیکن اپنے دوست فتح دین کے بیاہ میں شریک ہونے کے بعد اچانک اس کے دل نے ایک پھریری لی اور دوسرے روز اپنے ایک دشمن پر بے دھڑک آوازے کس دیئے! اس کے دوست بہت سٹپٹائے اور فیض کے اتنے زبردست پلٹے پر قسم قسم کی خیال آرائیاں کیں ——— "کہیں سے پستول ہاتھ لگ گیا ہوگا ———" "اب کے اس کی گوبھی کی کیاریاں آباد ہیں نا ———" اور اس قسم کی دیگر باتیں لیکن اصل بات کسی کو نہ سوجھی۔ اور وہ بات بہت چھپی چھپی تھی کیونکہ اس بات کو صرف فیض اور سونی ہی جانتے تھے۔!

سونی گاؤں کے بوڑھے چوکیدار کی لڑکی تھی۔ بہت شرمیلی اور سمٹی سمٹی' جیسے گلاب کی کلی سورج کی روشنی اور گستاخ جھونکوں سے لجائے اور پتوں میں چھپ چھپ جائے! باپ کی اکلوتی بیٹی تھی اس لیے اپنی مرضی کے خلاف بنی ٹھنی رہتی تھی۔ گلابی پاؤں میں سبز چمڑے کا جوتا' پیلی چھینٹ کا لہنگا' جاپانی اودے ریشم کی قمیض' سر پر تاروں بھری اوڑھنی' ناک میں چاندی کی موتی ایسی کیل' کانوں میں جھمر جھمر کرتے 'بندے' جن کے نیچے جیسے شبنم کے قطرے لس لس کرتے رہتے! گلے میں ہنسلی جس سے چاندی کے گھنگھرو لٹکے رہتے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

گوری بانہوں میں دھانی چوڑیاں اور پھرپاؤں میں سبز جوتوں کے اوپر ٹخنوں سے لپٹی ہوئی جھانجھنیں جو ہر قدم پر ایسا دلاویز چھنا کا پیدا کرتی تھیں جیسے بے شمار کوئلیں نیم کے چھتناروں میں چھپی رک رک کر کوکو پکار رہی ہوں!

فیض، فتح دین کی شادی پر اپنا بہترین لباس زیب تن کیے اپنے دوستوں کے ہمراہ چھت پر بیٹھا کنواریوں کے گیت سن رہا تھا۔ آٹھ دس لڑکیاں مل کر گاتیں۔ جوان میراثن سینہ تانے ڈھولک بجاتی، دانت نکالتی اور جھومتی اور جب گیت کا آخری سُر نازک گلوں میں مدھم ہوتے ہوتے ختم ہو جاتا تو ڈھولک کی دھمادھم دھپ کے ساتھ نئے گیت کی ابتدا ہو جاتی۔ کوٹھوں پر گاؤں والے دبکے بیٹھے تھے۔ ٹنڈمنڈ نیموں اور بیریوں میں شریر بچے چھپے گیت سن رہے تھے اور نیچے صحن میں لال اور پیلی اوڑھنیاں اور اودے اور گلابی لہنگے، لالٹینوں کی پیلی روشنیوں میں مٹتی ہوئی قوس قزح کی طرح جھلک رہے تھے۔ ایک نیا گیت شروع ہوا۔ میراثن کی انگلیاں ڈھولک پر والہانہ رقص کرنے لگیں اور لڑکیوں کی پتلی پتلی آوازیں بلند ہوئیں، جیسے کوئی سازندہ آٹھ دس سارنگیوں کے تاروں کو جھنجھنا رہا ہو کہ اچانک سب لڑکیاں خاموش ہو گئیں اور سارے مٹیالے منظر کو ایک تنہا آواز کا تیز نشتر چیرتا ہوا افق کی طرف اڑ گیا! الفاظ فضا میں کروٹیں لینے لگے۔

ترس ترس کر جی اور ہنس ہنس کر مرکہ ترستی
زندگی اور ہنستی موت ——

اور اچانک آواز رک گئی۔ اور گانے والی کو احساس ہوا کہ شریر لڑکیاں اس کی آواز سننے کے لیے چپ ہو گئی ہیں۔ وہ اس سازش پر غصے اور شرم کے مارے میراثن کی ڈھولک کے قریب فرش پر سر رکھ کر سہمی سہمی گنگنانے لگی اور لڑکیاں جھک جھک کر اور لیٹ لیٹ کر یوں ہنسیں جیسے گھپ اندھیرے میں اچانک ستارے ٹوٹ ٹوٹ کر بکھر جائیں!

www.iqbalkalmati.blogspot.com

چھت پر بیٹھے ہوئے نوجوان ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکرائے۔

ایک بولا۔ "آواز تھی یا سونے کا ایک تیر تھا جو دلوں کو چیرتا ہوا پار ہو گیا۔"

دوسرے نے کہا۔ "آواز تھی یا اس کبوتر کی اڑان تھی جس کے پنجوں سے گھنگھرو بندھے ہوئے ہوں۔"

اور ایک طرف سے فیض دبی دبی آواز میں بولا۔ "آواز تھی یا شفاف تالاب کی تہ میں چاندی کی گھنٹیاں بج اٹھیں۔"

نوجوان رک رک کر ہنستے ایک دوسرے سے لپٹ لپٹ گئے۔ اور فیض کو ٹھوکے دیتے ہوئے بولے!

"کچھوا اور ناچے!"

"مینڈک اور ملہار گائے!"

"چھچھوندر، اور سر میں چنبیلی کا تیل ڈالے!"

اور فیض اپنی ذرا ذرا سی مونچھوں پر انگلی پھیرتے ہوئے بولا۔ "بھئی ہمارے سینے میں بھی دل ہے۔"

سب نوجوان چپ ہو گئے جیسے انہیں فیض کی یہ دلیل پسند آ گئی ہو!

اتنے میں منڈیر کے قریب ایک نوجوان سر اٹھا کر بولا۔ "لیکن یہ تھی کون؟"

"سونی!"

"سونی؟"

"ہاں چوکیدار کی لڑکی، وہ جو بھڑکیلے کپڑے پہنتی ہے اور پھر بھی لجائی رہتی ہے۔"

"ہاں ہاں وہ بجلی!"

"اچھا وہ جادوگرنی!"

اور جب آدھی رات کو لوگ اپنے اپنے گھروں کو جانے لگے' چند لڑکیاں لمحہ بھر کے آرام کے لیے صحن میں سو گئیں اور کچھ اپنے گھروں کو چل دیں تو فیض ایک اندھیری تنگ گلی میں یہ سوچتا جا رہا تھا کہ بعض لوگوں کی آواز میں کتنی لذت اور مٹھاس ہوتی ہے۔ جیسے کانوں کے راستے کوئی شہد کے گھونٹ پلا رہا ہے! اور اس کا جسم تپ گیا اور دل ناچنے لگا اور اسے محسوس ہوا کہ اس کایوں نکوبن کر بیٹھے رہنا اس کی جوانی کے ماتھے پر بدنما داغ ہے اور سونی یا کسی اور الھڑ لڑکی کو باہوں پر ڈال کر اندھیری گھائیوں میں دھیرے دھیرے ترستی زندگی اور ہنستی موت کے گیت گانے میں جو کیفیت ہے وہ آرام سے ٹھنڈی ہوا کے ہلکوروں میں لمبی تان کر سونے میں بھی نہیں!

اس کا گھر گاؤں کے پرلے سرے پر تھا اس لیے اسے یہ انوکھی باتیں سوچنے کے لیے بہت وقت مل گیا اور جب وہ پرانے قبرستان کی ٹوٹی ہوئی دیوار کے قریب سے گزر رہا تھا تو چرچر کرتے جھینگر اچانک چپ ہو گئے اور ٹڈیاں اپنی طویل اور باریک "پیں پیں" کو روک کر دم بخود رہ گئیں۔ ساری فضا پر ایک خوفناک خاموشی چھا گئی کہ اچانک فیض ٹھٹھک کر کھڑا ہو گیا۔ اسے کانچ کی چوڑیوں کی آواز سنائی دی ——— اور اسے احساس ہوا کہ کوئی لڑکی اس سے چند قدم کے فاصلے پر بیٹھی چوڑیاں کھنکھنا رہی ہے۔ یہ کھنکھناہٹ فیض کو فتح دین کے صحن میں لے آئی۔ اور پھر وہ گرجتی ہوئی ڈھولک اور جھومتی ہوئی میراثن' وہ رنگا رنگ لباس اور وہ چوڑیاں ——— اور پھر سونی کی آواز جو اندھیرے منظر کو چکا چوند کرتی افق کی گود میں سو گئی ——— اور اسے ترستی زندگی اور ہنستی موت کا خیال آیا ——— موت اور ٹوٹی ہوئی قبروں والا قبرستان' ——— سوکھے ہوئے ڈھنچر اور خوفناک ڈائنیں' جو راتوں کو چوڑیاں بجاتی ہیں اور شکستہ دیواروں کے سوراخوں میں راہ چلتوں کی تاک میں چھپی رہتی ہیں! لمحہ بھر کے لیے اس کے دل پر جیسے برف کے گالے پڑ گئے۔ لیکن اچانک ایک اضطراری

www.iqbalkalmati.blogspot.com

حالت میں وہ گرج کر پکارا "کون ہے تو؟"

"سونی" آواز آئی اور فیض کو محسوس ہوا کہ واقعی قبرستان کے ایک کونے پر چھوٹے سے گڑھے میں جو پانی جمع ہو گیا ہے' اس کے نیچے کسی سوئی ہوئی جل پری نے' جس کی کلائیوں پر چاندی کی ننھی ننھی گھنٹیاں سج رہی ہیں' کروٹ بدلی ہے۔ جس کے ہر مسام سے پھوٹتا پسینہ اور پسینے کے ہر قطرے میں چمچماتی چنگاریاں اور دہکتا اور پھنکتا ہوا بدن رقص کرتی ہوئی روح!——فیض کے اوسان لڑکھڑائے اور اس اندھیرے منظر کی خنک تنہائی میں اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ سونی کے ہمراہ کسی دور دراز ملک کی طرف اڑا جا رہا ہے۔ اس حالت میں کہ سونی کا سر اس کے کاندھے پر ہے اور اس کی زلفیں فضا میں مسحور ناگنوں کی طرح لہرا رہی ہیں اور اس کے ٹخنوں کی جھانجھنوں کے چھنا کے سے فضا گنگنا رہی ہے۔

اچانک جھینگروں اور ٹڈیوں کی مسلسل تانیں خاموش نظاروں پر نشتر زنی کرنے لگیں اور فیض اس قبرستانوں اور تاریکیوں کی دنیا میں لوٹ آیا بولا

"یہاں کیا کر رہی ہو سونی؟"

اور سونی بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ "یہاں میری سونے کی مہر گر پڑی ہے۔ میں نے یہ مہر جاگیردار کی بیٹی سے آج رات کے لیے لی تھی اور میں اب فتح دین کے گھر سے اٹھ کر آ رہی تھی کہ یہاں مجھے چند ایک سہیلیوں نے چھیڑا اور ٹھٹھے مخول میں مجھے مہر کا خیال نہ رہا اور جب میں گھر پہنچی تو ماتھے کو خالی پا کر میرا دل دھک سے رہ گیا۔ واپس آ کر یہاں اندھیرے میں خاک پر ہاتھ پھیر رہی ہوں۔ ڈرتی ہوں۔ مہر لڑھک کر ادھر دھنسی ہوئی قبروں میں گر گئی تو کب ملے گی اور میرا باپ بہت خفا ہو گا کہ میں نے دم بھر کی رونق کے لیے ایسا غضب اٹھایا۔"

فیض کا جی بھر آیا۔ جیب سے ڈبیہ نکالی اور ایک دیا سلائی روشن کی۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

پہلی نظر سونی کے ماتھے پر پڑی جس کے عین وسط سے سیدھی مانگ اوپر لپک کر اوڑھنی میں چھپ گئی تھی۔ اس کی آنکھیں جھکی ہوئی تھیں اور پتلے پتلے ہونٹ کھلے ہوئے تھے۔ اس کی مکھن ایسی کلائیوں پر کانچ کی بے شمار چوڑیاں لپٹی ہوئی تھیں اور اس کے ہاتھ خاک آلود تھے۔

"فیض" وہ تعجب سے پکاری! اور فیض خوشی سے ہانپنے لگا کہ سونی اس کا نام جانتی تھی اور کسی دوشیزہ کو ایک نوجوان کا نام یاد رہنے کا یہ مطلب ہے کہ اس نوجوان میں کوئی خصوصیت موجود ہے۔

پھرر پھرر دیا سلائیاں جلنے لگیں اور آخر کار فیض ایک قبر کے کنارے جلی ہوئی جھاڑیوں کی جڑ میں سے مہر اٹھا لایا۔ اسے چولے سے پونچھا اور سونی کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے کہا۔ "لو سونی، شکر ہے مل گئی۔" اور جب اس کی خاک آلود انگلیاں سونی کی خاک آلود انگلیوں سے مس ہوئیں تو اندھیرا اور گہرا ہو گیا۔ ٹڈیاں چیخ اٹھیں۔ جھینگر چلّانے لگے اور دونوں نے محسوس کیا کہ ان کے جسم کپکپا رہے ہیں۔ ان کی آنکھیں ڈبڈبا آئی ہیں۔ ان کی انگلیاں پسیج رہی ہیں۔

کانپتی ہوئی آواز میں سونی بولی "تم نے بہت تکلیف کی۔ قبرستان کے کنارے قبروں کے درمیان ہاتھ پھیرتے پھرنا بہت حوصلے کا کام ہے۔"

اور فیض بولا۔ "اور یہ کتنا عجیب اتفاق ہے کہ ہماری ملاقات قبرستان کے کنارے اور قبروں کے درمیان ہوئی!——— اور سونی یہ اندھیرا کتنا گہرا اور گاؤں کتنا خاموش ہے——— اور سونی، تم نے وہ ترستی زندگی اور ہنستی موت کا گیت کتنا اچھا گایا تھا——— لیکن سونی تم شرما کیوں گئی تھیں——— تم اب کس رستے گھر جاؤ گی؟ کہو تو میں تمہیں تمہارے گھر پہنچا آؤں——— اور سونی ——— سونی تم میرا نام کیسے جانتی ہو؟"

اور سونی اندھیرے میں ٹوٹی ہوئی دیوار پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔

"میں تو تمہارا نام مدت سے جانتی ہوں کیونکہ تم میری پھوپھی کے پڑوس میں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

رہتے ہو۔"

اور فیض یہ بھولا بھالا جواب سنکر جھینپ سا گیا اور بولا۔ "اکیلی جاؤ گی؟"

"ہاں کیا ہرج ہے۔ ادھر جاگیردار کا کتا کبھی کبھی جھپٹ پڑتا ہے ورنہ کیا ہرج ہے۔"

اور پھر جب فیض اسے ٹوٹی ہوئی کھڑکی کے پاس پہنچا کر لوٹنے لگا تو سونی بولی "تم نے بہت تکلیف کی!"

بہت پرے ایک گلی کی نکڑ پر بیٹھا ہوا چوکیدار چلایا۔ "خبردار"——— اور فیض نے آہستہ سے کہا۔ "تمہارا باپ جاگ رہا ہے۔ ہولے ہولے چلو۔ تمہاری جھانجھنوں کا چھناکا نہ سن لے!"———اور فیض نے محسوس کیا کہ سونی اندھیرے میں مسکرا رہی ہے!

وہ رات کی وجہ سے سونی کو اچھی طرح نہیں دیکھ سکتا تھا۔ لیکن اتنا ضرور ہوا کہ اس کے دل و دماغ پر ایک خاص پیکر کا نقش جم گیا جس کی مانگ ستاروں کو گھول کر بنائی گئی تھی! اور جس کا سڈول سینہ اور ابھرے ہوئے کولہے اور سفید ٹخنوں پر گنگناتی جھانجھنیں اور گرد آلود اور تپتی ہوئی انگلیاں اور——— اور وہ بہت سی باتیں تھیں۔ جن کا اسے پہلے کبھی خیال تک نہ آیا تھا۔ لیکن جو اَب اس کے نس نس میں نشہ بن کر گردش کر رہی تھیں۔

اور یونہی زندگی کے اڑتے ہوئے لمحوں میں فیض اور سونی نے چند ایسی گھڑیاں چن لیں جن میں ان کے دھڑکتے دل رک جاتے اور جھپکتی آنکھیں ایک دوسرے کو گھورتی رہ جاتیں اور سونی سینہ تانے' بازو لہراتی' آنچل پھڑپھڑاتی کوندے کی طرح لپکتی ہوئی ہرتی پھرتی گلیوں میں غائب ہو جاتی اور فیض ننھی ننھی مونچھوں کو بل دے کر ہتھیلیوں پر ایسے پتھر اٹھاتا کہ کسی بیل کی پیٹھ پر رکھ دیئے جاتے تو وہ پچک کر زمین سے لگ جاتا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اب سونی کی ایک سہیلی کا بیاہ نزدیک تھا اور جاڑوں کی ایک سرد رات کو جب سارے گاؤں پر کہرا سا پھیلا ہوا تھا اور بکھرے ہوئے کھیتوں کے کنارے ٹڈے چرچرا رہے تھے، ایک کھنڈر کے پاس فیض نے سونی کے صاف چہرے کو اپنے دونوں ہاتھوں میں سنبھال کر اور آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا "تم اتنی گھبرا کیوں رہی ہو؟ میں لے آؤں گا تمہارے لیے سونے کی مہر۔ میں اب کے گوبھی کی رقم اکٹھی کرتا رہوں گا اور تمہاری سہیلی کے بیاہ سے دو چار دن پہلے کورے سونے کی ایک چمکتی دمکتی مہر تمہارے اس چاند سے ماتھے پر جھم جھم کرتی نظر آئے گی اور سونی شائد تم نہیں جانتیں کہ میں اس قسم کی کتنی مہریں تمہارے سر پر سے نچھاور کر سکتا ہوں اور سونی ـــــ سونی تم کتنی اچھی ہو۔"

اور سونی نے فیض کے بالوں میں پھنسی ہوئی ہاتھی دانت کی ننھی سے کنگھی کو اپنی انگلیوں میں گھما کر کہا۔ "تمہیں تکلیف ہو گی فیض ـــــ سونے کی مہر میں جاگیردار کی بیٹی سے مانگ لوں گی۔"

اور پھر اچانک انہیں پہلی رات یاد آگئی جب جاگیردار کی بیٹی کی مہر ایک دھنسی ہوئی قبر کے کنارے جلی ہوئی جھاڑی کی جڑوں میں پڑی ملی تھی۔ اور پھر وہ انگلیوں کا آتشیں مس اور اس کے بعد وہ خاموش راتوں کی پر شور گھڑیاں ـــــ دونوں ایک دوسرے کی ڈبڈباتی ہوئی پتلیوں میں ماضی کا ناٹک دیکھنے لگے اور تب تک دیکھتے رہے، جب ایک مرغے نے دور ایک درخت کی ٹہنی پر اس زور سے بانگ دی کہ سونی کا جسم کانپ گیا اور فیض کی آنکھیں جھپک گئیں۔

اور اب تھانیدار کے حکم سے لوگوں کو گوبھی کی کیاریوں کو پانی دینے سے روک دیا گیا۔ لیکن راتوں کو فیض کے کنویں سے بے شمار ڈولیں چھلکتی ہوئی نکلتیں اور گوبھی کی کیاریوں میں سرنگوں ہو جاتی۔ لوگ فیض سے شکایت کرتے کہ تم چمگادڑ کی طرح دن کو کیوں سوتے ہو؟ اور فیض جواب دیتا کہ جب

www.iqbalkalmati.blogspot.com

انسان بیکار ہو تو رونے یا سونے کے سوا وقت کیسے کٹے!

اور بیس دن بعد جب فیض کے پاس چودہ روپے جمع ہو گئے تو وہ قصبے کے سنار سے ایک مہر بنوا لایا جس کے پیچھے گولا کھ چمٹی ہوئی تھی لیکن جسکے سامنے سونے کا ایک پتلا پترا جگ مگ کر رہا تھا اور جس کے ساتھ ننھی سیپوں ایسے پترے اور شفاف موتی یوں لٹک رہے تھے جیسے چاند کے کنارے پر کسی نے تاروں کی جھالر ٹانک دی ہو۔

اندھیری شام کو وہ گاؤں سے آدھ میل کے فاصلے پر پہنچا تھا کہ راستے کے کنارے گنجان جھاڑیوں کے جھرمٹ میں سے چار سائے لپکے اور اسے دبوچ لیا۔ وہ بہت چیخا چلایا۔ وجہ پوچھی۔ لیکن اسے گھسیٹ کر چوپال میں لایا گیا۔ یہاں تھانیدار گیس کی روشنی میں اپنے لمبے طرے سمیت بیٹھا سامنے ٹک ٹک گھور رہا تھا۔ فیض کو دیکھتے ہی اس کے نتھنے پھول گئے اور ہنٹر اوپر فضا میں اٹھ گیا اور پھر شڑاپ شڑاپ کا سر——— اور الو کے پٹھے! کمینے! حرامزادے! بدمعاش! اور جانے کیا کیا——— اور پھر ادھ موئے فیض کے گٹھڑی بنے ہوئے جسم کو بوڑھے چوکیدار نے گھسیٹ کر ایک طرف کر دیا اور تھانیدار پکارا۔

”راتوں کو چھپ چھپ کر اس نے کیاریوں کو پانی دیا ہے اور گوبھی کے پھول بیچے ہیں۔ میرے حکم کی خلاف ورزی کرنے والوں کا انجام تمہارے سامنے ہے۔ میں تمہیں بتا دینا چاہتا ہوں کہ اگر پھر کوئی اس قسم کا بدمعاش میرے ہتھے چڑھ گیا تو میں اس کی بوٹیاں نوچ کر کتوں کے آگے ڈال دوں گا! میں تمہاری ماؤں بہنوں——— “ اور پھر دہقانوں سے پٹی ہوئی گلیاں اچانک سنسان ہو گئیں۔ تھانیدار پیچوان کے کش لگاتا اندر گدگدے پلنگ پر دراز ہو گیا اور بوڑھا چوکیدار اس کے پاؤں دابنے لگا۔ فیض چوپال کی سیڑھیوں پر سے کھسک کر اترا اور کراہوں کو روکتا؟ گلی کے اندھیرے میں چھپتا' قبرستان کی شکستہ دیوار کے پاس بیٹھ کر سستانے لگا۔ اور تاروں بھرے آسمان کے بالمقابل جمے ہوئے ٹنڈمنڈ

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بیریوں کے آبنوسی سایوں نے دیکھا کہ ایک لڑکی جس کے ٹخنوں سے لپٹی ہوئی جھانجھنیں ہر قدم پر ایک دلاویز چھناکا پیدا کرتی ہیں' اور جس کی ناک میں چاندی کی موتی ایسی کیل ہے' اپنے پیلی چھینٹ کے لہنگے سے اس کے زخم دھو رہی ہے۔ اور جب فیض کی خون آلود انگلیوں نے ایک طلائی مہر اس کی حنائی انگلیوں میں تھما دی تو اندھیر گہرا ہو گیا! ستارے ماند پڑ گئے! ٹڈیاں اور جھینگر چیخ اٹھے! اور ملائم تپتے ہوئے' بھیگے ہوئے گال ایک زخم خوردہ چوڑی چھاتی پر بہت دیر تک پڑے دھڑکتے رہے!

✿

www.iqbalkalmati.blogspot.com

توبہ میری

کھنّوں کھنّوں ـــــ اے کھنّوں۔ توبہ میری! کھنّوں' ذری باہر آنا بڑھیا ـــــ ب ـــــ بڑھیا! وہ لُٹیا ادھر سرکا دے ری۔ توبہ میری! کھنّوں کھنّوں۔ کریم تو اب اچھا ہے' تو کدھر جا کر مر گئی؟ توبہ میری!"

چونے کی سی سفید داڑھی' گنجا سر' لٹکی ہوئی ناک' اندر گھسے ہوئے ہونٹ' سلوٹیں پڑا چہرہ' جیسے کوئی لاش بیٹھی کھانس رہی ہے! دہلیز کے باہر ایک کھٹولے پر بیٹھا پھیپھڑوں کے سمٹنے پھیلنے کے جھٹکوں سے گھٹنوں میں سر دیئے جھک جھک جاتا ہے۔ ساتھ کی دیوار بلغم سے پٹی پڑی تھی۔ دور دو بیل کھڑے خشک تنکوں پر منہ مار رہے تھے۔ گلی میں پنہاریاں پانی بھری گاگروں سے لدی سینہ تانے ایک گلی میں گھسی جا رہی تھیں۔

کبڑی بڑھیا اندر سے ہانپتی ہوئی نکلی۔ "ارے کیا شور مچا رکھا ہے تو نے؟ گھڑی بھر کے لیے اندر جاتی ہوں کہ تیرے گولی لگ جاتی ہے۔ ہاتھ بڑھا کر لٹیا کھسکا لی ہوتی۔"

بوڑھا کھانستے ہوئے بولا۔ "اے اتنا غصہ نہ دکھا۔ گھونٹ بھر پانی پلا

www.iqbalkalmati.blogspot.com

دے۔ میرا حلق جل رہا ہے۔"

"تجھے کیا معلوم اندر تیرے لال پر کیا بیت رہی ہے۔ سانس لینا بھی دوبھر ہے اسے۔ اب پھر پھٹی نظروں سے دیکھنے لگا ہے' ہاتھ پیر جھٹکتا ہے اور بے مطلب باتیں کرتا ہے۔ ایک بار تو پتھرا گئی تھیں اس کی آنکھیں۔"

بوڑھے نے لٹیا لے کروہیں دھر دی اور کھٹولے پر سے اپنی سوکھی لکڑی ایسی ٹانگیں لٹکا کر بولا۔ "لے ذری مجھے تھام کے لے چل۔ میں سمجھا' موسمی تاپ ہے اتر جائے گا۔ تو نے تو بڑی بھکی بات کر دی۔ کلیجہ ہلا دیا میرا۔ لے ذری تھام میرا ہاتھ' کھینچ مجھے۔ توبہ میری۔"

کھسکتے ہوئے دونوں اندر گئے۔ پھٹے پرانے بستر پر ایک نوجوان پڑا کراہ رہا تھا۔ گردن کو اس بیقراری سے جنبش دیتا تھا جیسے اس کے سر میں شعلے اٹھ رہے ہوں۔ پاؤں یوں جھٹکتا تھا۔ جیسے تپتے لوہے پر چل رہا ہے۔ ہونٹ اوپر چڑھ گئے تھے۔ بتیس کے بتیس خوب صورت زرد دانت مسوڑھوں سمیت نظر آرہے تھے!

بوڑھا اس کی کھاٹ کے قریب جا کر گر سا پڑا۔ "ارے کریم خاں' اے کریم بیٹا' بیٹا کریم' اے کریمو' اے بات سن میری۔ سن رہا ہے کیا؟ کھنوں ـــــ کھنوں کھنوں ـــــ کھنوں ـــــ اے ـــــ اے سنتا ہے کچھ؟ تیرا بوڑھا باپ تیرے سامنے بیٹھا ہے۔کیا کھائے گا؟ پانی پیئے گا؟ پیاس ہے؟ نہیں ہے؟ ـــــ اری دیکھ سر ہلا رہا ہے تیرا لال ـــــ پیاس نہیں ہے اسے۔ کھانا کھائے گا؟ صبح والی کھچڑی گرم کر لا ـــــ اے سنتی ہے؟ ـــــ کریم بیٹا تم بولتے کیوں نہیں؟"

بے قرار سرخ آنکھیں بوڑھے کے زرد چہرے پر جم گئیں اور پپڑیاں جمے ہونٹوں میں ناتواں سی جنبش ہوئی۔ "میرے دل پر بہت بوجھ ہے ابا۔ میں بہت پریشان ہوں۔"

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"یہ بخار کمبخت اسی طرح زور سے چڑھتا ہے' اور اترتا بھی پل میں ہے۔ بس چٹکی بجاتے ہیں۔" بوڑھے نے اپنی بوڑھی بے رونق انگلیوں سے چٹکی بجانا چاہی مگر ناکام رہا!

نوجوان پھر اسی دھیمی درد ناک آواز میں بولا۔ "کل مولبی جی کہہ رہے تھے۔ میں نے بوڑھے نیم کے نیچے پیشاب کر دیا' اس لیے نیم کی پرانی ڈائن میرا کلیجہ نکال کر کھا گئی۔ کلیجے والی جگہ مجھے خالی جان پڑتی ہے"۔—— اس نے چھاتی پر ہاتھ پھیرا۔

بوڑھا ڈر گیا مگر تسلی دیتے ہوئے بولا۔ "آج اسی لیے تو بہت سی گھنگنیاں بانٹی تھیں تمہاری ماں نے' مٹھی مٹھی بھر بچوں کو دیتی گئی اور وہ تمہاری صحت کے لیے دعائیں مانگتے رہے۔ شکر ملا کر مولبی جی کے ہاں بھی بھجوا دی تھی کورے برتن میں ڈال کر۔ بڑھیا نیم تلے بھی بکھیر آئی تھی۔ اب تو اچھا ہو جائے گا لے آئی کھچڑی؟" بوڑھے نے ہاتھ ٹیک کر پلٹتے ہوئے کہا۔ "رکھ دے ادھر۔ اٹھا اپنے لال کو۔ کھالے میرے بچے۔ دو چار دانے نگل لے۔ طاقت آجائے گی۔ پریشانی دور ہو جائے گی۔ نہیں کھائے گا؟ تو وہیں ہنڈیا میں ڈال آری۔ باہر رہنے سے بو پڑ جائے گی اس میں۔ شام کو کام آئے گی۔ بچے! کچھ سونے کی کوشش...... کھوں—— کھوں کھوں—— کھوں—— اغ —— اخاہ —— تھوہ!" بوڑھا زمین پر جھک گیا اور پھر دونوں آنکھیں کپڑے سے رگڑتے ہوئے بولا۔ "توبہ میری!"

کبڑی بڑھیا ہانپتی ہوئی آئی اور بچے کے سرہانے بیٹھ کر اس کے ماتھے کو دھیرے دھیرے سہلانے لگی۔ بوڑھا کھاٹ کے ایک بازو پر کہنیاں دھرے کریم کے ابھرتے اور بیٹھتے سینے کو ٹکٹکی باندھے گھورنے لگا۔ کریم اب اتنا بے قرار نظر نہ آتا تھا۔ بڑھیا ہولے ہولے پھٹی پھٹی آواز میں گنگنانے لگی۔ الحمدللہ رب العالمین۔ الرحمٰن الرحیم......"

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بوڑھے کے ہونٹ بھی ہلنے لگے اور آنکھوں میں پانی بھر آیا اور پھر ایک ساتھ دونوں نے کریم کے ماتھے پر "چھو" کی۔ کریم کی آنکھیں پھیل گئیں اور بوڑھا جوڑا خوشی سے لرزنے لگا جیسے انہوں نے اپنے لال کو آب حیات کا ایک مٹکا پلا دیا ہے۔!

کریم کی آنکھ لگ گئی۔ بڑھیا آہستہ سے اٹھ کر دہلیز پر آبیٹھی۔ اور بوڑھا پیچھے کھسکتا ہوا دیوار سے لگ کر اونگھنے لگا۔!

دو سال سے بوڑھا کوئی کام نہ کر سکتا تھا۔ اور دو سال سے ان کا نوجوان بیٹا کریم چھکڑا چلاتا تھا۔ گاؤں سے قصبے تک اسے چونی مل جاتی تھی۔ اور پھر ہفتے میں تین بار تو قصبے کے سیٹھ اسے ضرور بلا لیتے تھے۔ مہینہ بھر سے بوڑھے والدین کو کریم کی شادی کی فکر پڑگئی تھی اس لیے کھانے کے بجائے بچانے میں انہیں مزا آنے لگا۔ ماں باپ کا یہ نیا شوق دیکھ کر کریم بھی لمبے لمبے سفروں پر جانے کے لیے تیار ہو جاتا۔ بڑھیا پرسوں گرتی پڑتی گاؤں میں ایک لڑکی کے متعلق بات بھی کر آئی تھی اور اسے لڑکی کے والدین کی باتوں میں امید کی جھلکیاں بھی نظر آگئی تھیں، کیونکہ جب واپس آئی اور بوڑھے نے اس کا ہاتھ پکڑ کر پوچھا۔ "اے اب بتا بھی۔ منہ اٹھائے کدھر بھاگی جا رہی ہے؟" تو وہ تھوک نگلتے ہوئے بولی۔ "میں دو نفل شکرانے کے پڑھ لوں، پھر بتاؤں گی سارا حال۔" بوڑھے کو وفورِ مسرت میں کھانسی چھوٹ گئی اور وہ زمین پر زور زور سے تھوکتے ہوئے بولا۔ "توبہ میری، اے توبہ —— شکر ہے، شکر ہے میرے مالک، اخ تھو! شکر ہے —— توبہ میری!"

کل شام سے کریم کو بخار آ رہا تھا۔ سارے گاؤں میں یہ وبا پھیلی ہوئی تھی۔ ہر گھر سے بنفشے کے کاڑھے کی بو آتی تھی اور لوگوں کو چائے کی چسکیاں دیتے دیتے ذیلدار تنگ آگیا تھا۔ دوکانداروں نے سونف اور گلقند کا بھاؤ چڑھا دیا تھا۔ بوڑھے نے بھی پرانے میلے چیتھڑوں میں بندھی ہوئی جڑی بوٹیوں کو

کھول کر پھنکی بنائی اور کریم کو کھلا دی مگر اسے ایسا بخار چڑھا کہ اس کے جسم سے گز گز بھر کے فاصلے سے تپش محسوس ہوتی تھی۔ پہلے تو دیوانے ہو گئے دونوں۔ بے مطلب ایک جگہ سے دوسری جگہ گرتے پڑتے رینگنے لگتے اور بڑبڑاتے جاتے۔ "اب کیا کیا جائے؟ اب کیا ہو گا! کیسے چل رہی ہے نبض؟ سانس کیسے آ رہی ہے؟ ماتھے پر پسینہ آ گیا کیا؟ پاؤں ٹھنڈے ہو گئے؟ طبیعت متلا رہی ہے اِس کی؟ اب کیا ہو گا؟"

لیکن آدھی رات کو کریم کا بخار ہلکا ہوا تو جان میں جان آئی۔ البتہ نیند نہ آئی۔ بوڑھا کھانستے کھانستے بے حال ہو گیا۔ کسی نے اچانک زور سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ کریم کی آنکھ لگ رہی تھی۔ بھڑک کر اٹھ بیٹھا اور پھٹی پھٹی نظروں سے سامنے گھورنے لگا۔ بوڑھا چلا کر بولا۔ "اے کون ہے اس وقت؟ کیا کام ہے؟ دہلا دیا میرے بچے کو!"

باہر سے ایک کرخت آواز آئی۔ "اے بوڑھے' ملک جی کہہ رہے ہیں آج سوؤ گے یا یونہی کھانستے اور کھنکارتے رہو گے۔ تمہاری کھانسی نے محلے بھر کی نیند حرام کر رکھی ہے۔ ملک جی کروٹیں بدل رہے ہیں شام سے! کہتے ہیں بوڑھے سے کہو اتنا زور سے نہ کھانسے۔"

"مجال ہے حضور۔ مجال ہے میری۔ کھ کھ کھئوں......(منہ میں کپڑا ٹھونس کر) مجال ہے مجھ غلام کی۔"

کریم نے پوچھا۔ "کیا بات ہے؟ کون تھا؟"

بڑھیا بولی۔" ملک جی نے تمہارا حال پوچھ بھیجا ہے۔"

کریم نے ایک بار آنکھیں جھپکائیں اور بند کر لیں ——— ملک جی ان کے پڑوس میں رہتے تھے۔ قصبے میں ان کا بہت بڑا کاروبار تھا۔ ذرا بد دماغ واقع ہوئے تھے۔ ایک بار صاحب بہادر دورے پر تھے۔ ملک جی کے آگے بوڑھے نے ہاتھ جوڑے کہ بالشت بھر زمین پر اگتا تو خاک نہیں۔ لگان کہاں سے ادا

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کروں۔ لیکن انہوں نے یہی رٹ لگائے رکھی کہ "صاحب بہادر کے سامنے پیش کردوں گا۔ وہ حوالات میں بند کر کے نکال لیں گے پیسے تیری گڑی ہوئی تجوری سے۔ سرکار اپنی ایک کوڑی بھی نہیں چھوڑتی' سمجھے؟ تُو تو سٹھیا گیاہے۔!"

اور واقعی ملک صاحب نے صاحب بہادر کے سامنے بوڑھے بڑھیا کو پیش کر دیا۔ صاحب بہادر کو بھی بوڑھے نے وہی جواب دیا تو انہوں نے اپنی پتلی چھڑی سے بڑھیا کی بالیاں چھوتے ہوئے کہا۔ "ول انہیں بیچ ڈالو۔ سرکار پیسہ نہیں چھوڑے گا۔ سرکار کا پیسہ تم نہیں رکو! سرکار جیل بھیج ڈے گا۔ سرکار سزا ڈے گا۔ سمجھا تم لوگ؟ ایں؟"

صاحب بہادر نے بڑھیا کی بالیاں کیا چھوئیں' بوڑھے کے کلیجے پر انگارہ دھر دیا۔ مچھلی کی طرح تڑپ گیا۔ بڑھیا کو اشارہ کیا۔ اس نے بالیاں نوچ کر صاحب بہادر کے قدموں میں ڈال دیں اور دونوں گھر چل دیئے۔ "بڑا واہیات ہے یہ بوڑھا۔" صاب بہادر سگار کو انگلیوں میں گھماتے ہوئے بولے۔ لیکن بوڑھے کے دل میں جیسے کسی نے پگھلا ہوا سیسہ بھر دیا تھا! بل کھاتا جا رہا تھا اور بڑبڑا رہا تھا۔ "بڑا آیا صاحب بہادر بن کر وہاں سے! گاؤں بھر کے سامنے بالیوں پر چھڑی پھیرنے لگا۔ حاکم تھا ورنہ کمبخت کی یوں گردن اینٹھتا کہ صاحب بہادری دھری رہ جاتی۔ پیسے کی خاطر میری عزت پر ہاتھ پھیرتا ہے۔ اونہہ!"

اور بڑھیا بیچاری نے بھی وہ رات روتے بسورتے گزار دی۔

ملک جی نے اس دن سے اس گھر سے مکمل قطع تعلق کر لیا تھا۔ مگر اب اتنا کرم کرتے تھے کہ کبھی کبھار کریم کو بلانے آنکلتے اور وہ دن بھر سر ٹیک کر چونی کما لیتا۔

آج پوچھٹے کریم پر بخار نے پھر حملہ کیا۔ ایک بار درد کی بھی شکایت کی۔ مگر بوڑھے کی ہچکی آڑے آ گئی۔ دوپہر کو بخار کچھ ہلکا ہوا تو بوڑھا باہر آن

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بیٹھا تھا کہ بڑھیا کے کہنے پر پھر اندر جانا پڑا۔

اب کریم سو رہا تھا۔ بوڑھا دیوار کا سہارا لیتا بڑھیا کے پاس جا بیٹھا اور بولا "کتنی رقم ہو گئی؟ ہنسلی بن جائے گی۔ کڑے بھی تو بنوانے ہیں! اور سنا ہے۔ ہماری بہو شلوار پہنتی ہے۔ گھیرے والی۔ کوئی اچھا سا بھڑکیلا کپڑا خرید لو شلوار کے لیے۔ یہ جو نئے نئے کپڑے نکلے ہیں' ان میں سے چھانٹنا۔ دیکھو۔ حرف نہ آئے میرے لال کی جوانی پر۔ اسی کی کمائی ہے۔ اسی پر خرچ ہو تو ہمیں کیا۔ ہمیں تو خوشی ہے۔ ہمیں دو وقت کے کھانے سے غرض ہے۔ سو کچھ کمی نہیں' اللہ کا فضل ہے!"

بڑھیا بولی۔ "ساڑھے بارہ روپے ہو گئے تھے۔ ڈیڑھ روپیہ دوا دارو اور گھنگھنیوں پر خرچ آیا۔ پانچ آنے کی شکر بھی لائی تھی۔ اچھا ہو کر کما لائے گا میرا لال ——— ادھر ملک جی سے کچھ مانگا ہوتا۔"

"الٹا جوتا دکھاتے ہیں ملک جی۔ لگان والی بات یاد ہے؟"

بوڑھی کے کانوں کی لویں لرز گئیں جن میں ایک ایک کھلا سوراخ جیسے پرانی یاد کو تازہ کر رہا تھا'

کچھ دیر کے بعد بڑھیا اندر گئی اور پھر ہاتھ نچاتی باہر آ کر بولی۔ "اتر گیا بخار۔ چہرے پر رونق آ رہی ہے۔ اب اچھا ہو جائے گا۔"

بوڑھا اکڑوں بیٹھ کر تھوکتے ہوئے بولا۔ "پھنکی کی کرامات ہے یہ۔ تین دن ہوئے نورے کے اونٹ کے پیٹ میں مروڑ اٹھ رہے تھے۔ گڑ میں ملا کر یہ پھنکی کھلائی تو اٹھ کر اسی وقت بھاگنے اور ڈکرانے لگا۔ بڑے بوڑھوں کی چٹکیاں اکسیر ہوتی ہیں۔"

دونوں اندر کریم کے پاس چلے گئے۔ کریم اب چارپائی پر اٹھ کر بیٹھ گیا اور اس کی ماں بہت دیر تک اس کے شانے اور پیٹھ سہلاتی رہی۔

چراغ جلے ملک جی آ دھمکے۔ تینوں کے دل دھک سے رہ گئے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بوڑھے نے منہ میں کپڑا ٹھونس لیا۔ بڑھیا پریشانی میں ہاتھ ملنے لگی اور کریم چارپائی پر سے اٹھنے کی کوشش کرنے لگا۔

ملک جی بولے۔ "کیوں؟ کیا ہے۔ خیریت تو ہے؟"

"بخار ہو گیا ہے اسے" بڑھیا بولی۔

"اب کیسا ہے؟"

"جی اچھا ہوں اب تو۔"

"اب اچھا ہے جی۔" بوڑھا منہ سے کپڑا نکالتے ہوئے بولا۔ "اب اچھا ہے ورنہ ہم تو ناامید ہو بیٹھے تھے۔ قرآن شریف کے ختم کے ارادے کر رہے تھے ہم تو۔"

ملک جی بولے۔ "جنگ کی وجہ سے گیہوں کا نرخ چڑھ گیا ہے نا۔ اس لیے میں آج سو بوریاں قصبے میں بھجوانا چاہتا ہوں۔ صبح صبح وہاں پہنچ جانی چاہئیں۔ کریم اگر آسکے تو آج رات چھ آنے ملیں گے۔"

"توبہ۔" بوڑھا بولا۔ "یہ کیسے آسکتا ہے جی۔ یہ تو بڑی مشکل سے اٹھا ہے اب" بڑھیا بلبلا اٹھی۔ "سانس لینا بھی دوبھر ہے اسے' بہت کمزور ہے جی۔"

"میں اچھا ہوں۔" کریم بولا۔ "میں چلوں گا قصبے میں۔ کس وقت چلنا ہو گا؟"

ملک جی بولے۔ "ابھی! دوسرے چھکڑوں والے تو لاد بھی چکے ہوں گے۔"

"تو میں آیا۔"

ملک جی چل دیئے۔ بوڑھے اور بڑھیا نے کریم کی منتیں کیں کہ اس حالت میں چھ آنے کے لیے سرد رات میں سفر کرنا خطرے سے خالی نہیں۔ لیکن کریم بولا "کمبل اوڑھ لوں گا۔ آخر ہم لوگ ذرا ذرا سی باتوں پر یوں آرام

کرنے لگے تو پیٹ کیسے بھرے گا اور ہنسلیاں کڑے اور شلواریں کیسی بنیں گی؟ میں صبح سویرے پلٹ آؤں گا گھر کو۔ چائے بھی لے آؤں گا قصبے سے۔ اور کچھ ضرورت ہو گی۔"

کریم اٹھا۔ بوڑھا جوڑا پریشان اور حیران اسے دیکھتا رہا۔ کریم نے کمبل اوڑھا چہرے پر پگڑی کا ایک پلو پھیلا دیا اور باہر آکر چھکڑے کے آگے بیل لگا دیئے۔

بوڑھا بولا۔ "دیکھ رہی ہے ری؟ شادی کی خوشی میں جان کی پروا نہیں کرتا۔"

"ہاں کل کہہ رہا تھا' میں کوڑی کوڑی اکٹھی کروں گا' پر تم کو دم بھر کے لیے بھی کسی کا محتاج نہ ہونے دوں گا۔ اسے اپنی شادی کی اتنی فکر نہیں جتنی ہماری فکر ہے۔"

"اے تو کیا جانے۔" بوڑھا بولا۔ "تو نہیں جانتی۔ دیکھ وہ چل دیا۔ یا الٰہی خیر۔"

"فی امان اللہ۔ اف کتنی سردی ہے۔"

"توبہ میری!"

چھکڑوں کی قطار کچی سڑک پر چرچراتی ہوئی چلی تو یکے بعد دیگرے سب چھکڑے والے کریم کو کوسنے لگے۔ "اے باگ ہلا' ورنہ پیچھے ہٹ آ۔ ہمیں تو راستہ دے۔ کیا تخ تخ لگائے جا رہا ہے؟ سو رہے ہیں تیرے بیل؟ پیچھے ہٹ آ۔"

اور اس طرح کریم پیچھے ہٹتے ہٹتے قطار کے آخری سرے پر پہنچ گیا۔ تمام چھکڑے والے کریم سمیت بوریوں پر لیٹے جا رہے تھے اور اندھیری رات پہیوں کی بھیانک چیخوں سے گونج رہی تھی۔

صبح کو دن چڑھے ملک جی غصے سے لال پیلے بوڑھے کے پاس آئے اور

www.iqbalkalmati.blogspot.com

چلّا اٹھے۔ "کدھر گیا وہ تمہارا لاڈلا؟ کہاں پھینک آیا میری بوریاں؟ اس کے ساتھی قصبے سے ہو کر آ بھی گئے کب کے۔ اور وہ اب تک وہاں نہیں پہنچا گھر میں تو سب کچھ نہیں ڈال گیا؟"—— اور ملک جی اندر آکر چارپائیوں کے نیچے جھانکنے لگے۔ "کدھر مر گیا وہ بدمعاش؟"

بوڑھا کانپتے ہوئے بولا۔ "وہ جی بس رات کو نکلا تھا سب کے ساتھ۔ پھر واپس نہیں آیا اب تک۔"

بڑھیا بولی۔ "سودا خریدنا تھا قصبے میں! ابھی آجائے گا۔"

"مگر میری بوریاں کیا ہوئیں؟" ملک جی زور سے فرش کو ٹھکراتے ہوئے گرجے۔

اچانک بوڑھا چلا اٹھا۔ "وہ رہا ہمارا چھکڑا۔"

"بوریوں سمیت۔" بڑھیا ناک پر انگلی رکھتے ہوئے بولی۔

"اور بادشاہ سلامت سو رہے ہیں اوپر۔ خدا جانے کہاں کہاں کے چکر کاٹ کر آرہے ہیں بیل۔" ملک جی بولے۔

لوگ چھکڑے کی طرف جھپٹے۔ بوڑھا جوڑا بھی ان کی عقب میں رینگتا ہوا جانے لگا۔

"اے حضور عالی۔ اے ملک کریم خاں جی۔ اٹھو جی۔" ملک جی کریم کا لٹکا ہوا بازو ہلا کر بولے۔

ان کا ایک ملازم آگے بڑھا اور کریم کے چہرے پر سے کمبل کھینچ کر پکارا۔ "اے کریمو اٹھو بھی۔ ایسی بھی کیا نیند ہوئی کہ......."

"اے ذرا دیکھنا اوپر چڑھ کر۔" ملک جی بولے۔ "کیا ہو گیا اسے۔"

ایک شخص چھکڑے پر چڑھ گیا۔ کریم کی پتلیاں اوپر چڑھ گئی تھیں اور تھکی ہوئی آنکھیں ہڈی کے پرانے بٹنوں کی طرح بے نور تھیں۔

ملک جی ناک پر رومال پھیلاتے ایک طرف ہو کر بولے۔ "مر گیا

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہے۔"

دور بوڑھا بڑھیا کا ہاتھ تھامے پکار رہا تھا۔ "اے ذرا تیز چل۔ تیری آواز سے جاگ اٹھے گا وہ۔ قدم تک نہیں اٹھا سکتی تو! توبہ میری!"

✿

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بھوت

جب بھیگی ہوئی شاموں کو چڑیوں کے قافلے ہواؤں کو چیرتے ہوئے دور پھیکے پھیکے اندھیرے میں گم ہو جاتے اور جب چولھوں اور تنوروں سے نکلا ہوا دھواں گہرا بادل بن کر چھا جاتا تو ولی سر جھکائے گھر سے باہر نکلتا اور سرسبز کھیتوں کے گھاس سے ڈھکے کناروں پر سے ہوتا ہوا سرکاری ذخیرے کے اس حصے میں پہنچ جاتا جہاں دن کو بھی حواس قائم نہیں رہ سکتے تھے۔ فلک بوس سیاہ چوٹیاں' گہری خوفناک گھاٹیاں' گنجان جھاڑیاں' جن میں سے اکثر سانپوں کے پھنکارنے کی آوازیں آتی تھیں اور کئی راتوں کو تو چرواہوں نے موسلا دھار بارش میں بھی ان گھاٹیوں میں دیئے جلتے دیکھے تھے۔ لیکن ولی کے قدموں میں نہ کوئی ہچکچاہٹ ہوتی' نہ اس کی رفتار میں کسی قسم کی تبدیلی آتی۔ وہ اسی طرح سر جھکائے سست سست قدم اٹھاتا بڑھتا جاتا' گویا برسوں سے انہی راہوں پر چل پھر رہا ہے۔ وہ ان دشوار گزار پہاڑیوں پر سے نہایت آسانی سے نیچے اتر جاتا۔ گول گول پتھر اس کے قدموں کے نیچے جم کر رہ جاتے۔ وہ نیچے اتر کر ایک چشمے کے کنارے بیٹھ جاتا اور دردناک سروں میں ایسے دکھ بھرے گیت گاتا کہ آس

www.iqbalkalmati.blogspot.com

پاس کی پہاڑیاں گونج اٹھتیں اور کالی چوٹیوں کے اوپر ننھے ننھے ستارے شدت درد سے اس زور کے ساتھ کپکپاتے جیسے ابھی لپک کر اس گھاٹی میں آرہیں گے۔ ان گھاٹیوں کے ارد گرد رہنے والے دہقانوں نے ولی کے ان گیتوں کو بھی غیر مرئی مخلوق کی دل لگی پر محمول کیا اور پندرہ بیس دن کے بعد تو گاؤں بھر میں اس عجیب و غریب روح کے متعلق چہ میگوئیاں ہونے لگیں جو آدھی رات تک علاقے کی زبان میں ایسے شعر گاتی ہے...... کہ...... (اور یہاں وہ اپنے روائتی مبالغے سے کام لیتے)...... چشموں کا پانی ابلنے لگتا ہے' آس پاس چراغ جلنے لگتے ہیں' درختوں کی چوٹیاں جھک جھک کر زمین کو چھونے لگتی ہیں۔ ——— گھنگھروؤں کے جھنجھنانے کی آوازیں آتی ہیں' آسمان سے جو ستارہ ٹوٹتا ہے وہ ادھر ہی کا رخ کرتا ہے!

گاؤں سے یہ باتیں نکل کر سارے علاقے میں پھیل گئیں اور کچھ دن کے لیے چوپال پر انہی کے متعلق قیاس آرائیاں ہوتی رہیں۔

لیکن ولی نے اپنے دکھے دل کی بھڑاس نکالنے کے لیے یہ خوفناک جگہ صرف اس لیے چنی تھی کہ یہاں وہ اپنے زندگی کی چند سنہری گھڑیاں گزار چکا تھا اور یہاں اسے دنیا کے جھوٹے درد مند اور رسمی غمخوار نہیں ستا سکتے تھے۔ یہاں وہ جی کھول کر خدائے سمیع و بصیر کے حضور میں' وہ فریاد بے کھٹکے پیش کر سکتا تھا۔ جو دن کے وقت اس کا دم گھونٹ لیتی تھی۔

اپنے آپ کو بے درد لوگوں سے محفوظ رکھنے اور ان کے شکوک کو اور زیادہ مضبوط کرنے کے لیے اس نے دو چار موم بتیاں بھی خرید لی تھیں اور ایک دو گھنگھرو بھی جیب میں ڈال لیے تھے۔ اب وہ گھاٹی میں چشمے کے کنارے موم بتیاں جلا دیتا' کبھی کبھی گھنگھروؤں کو ہلا دیتا اور خود کسی چٹان کی اوٹ میں بیٹھا گیت گاتا رہتا۔ کچھ دیر وہاں بیٹھتا اور پھر موم بتیاں بجھا کر اور گھنگھرو وہیں کسی جھاڑی میں چھپا کر واپس گاؤں آجاتا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ایک رات اسے راستے میں گاؤں کا بوڑھا چوکیدار مل گیا۔ بوڑھے نے زور سے پوچھا۔ "خبردار۔ کون ہے تو؟"

اس نے آہستہ سے کہا۔ "ولی محمد۔"

بوڑھا نزدیک آکر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔ "مگر بیٹا ایسی اندھیری رات میں کدھر نکل گئے تھے؟ تم نے سنا نہیں سرکاری ذخیرے کی پورب والی گھاٹیوں میں آج کل جنات نے ڈیرے ڈال رکھے ہیں؟ آدھی رات تک بتیاں جلتی ہیں' گیت گائے جاتے ہیں' ناچ ہوتے ہیں۔ میں نے یہاں گاؤں میں بھی کئی بار ان کے گھنگھروؤں کی آواز سنی ہے۔ آج کل علاقے پر بڑا بھاری وقت آیا ہوا ہے۔ ہوش سے چلا پھرا کرو' کہیں کوئی بھتنا تمہیں دبوچ نہ لے۔ بڑی ظالم مخلوق ہوتی ہے یہ۔ راہ چلتے کو چھیڑتے ہیں اور پھر گردن مروڑ کردم لیتے ہیں۔"

ولی نے جواب دیا۔ "بابا جی! مجھے خدا کی ذات پر پورا بھروسہ ہے۔ میں اس کے سوا کسی چیز سے نہیں ڈرتا۔"

بوڑھا زور سے کھنکارا اور ایک گلی میں مڑ گیا۔

گھر والے اس کے کھوئے کھوئے انداز اور سوئی سوئی آنکھیں دیکھ کر پریشان رہنے لگے۔ اس کی نوجوان بیوی آدھی آدھی رات تک جاگتی رہتی اور جب ولی واپس آتا تو پوچھتی۔ "تم آج پھر دیر سے آئے؟ آخر چوپال والوں کو گپیں ہانکنے کے سوا اور کوئی کام نہیں کیا؟"

اس کی بوڑھی ماں بھی جاگ اٹھتی اور کہتی۔ "بیٹا! آج کل بھوتوں نے علاقے میں ادھم مچا رکھا ہے' اتنی دیر تک باہر نہ رہا کرو۔"

اس کا ننھا سا بچہ بھی آنکھیں ملتا غوں غوں کرتا اٹھ بیٹھتا جیسے اپنی توتلی زبان میں باپ سے اس رویے کی وجہ پوچھ رہا ہے۔

ولی ان سب کا جواب پھیکی سی مسکراہٹ سے دیتا اور دھم سے کھاٹ

www.iqbalkalmati.blogspot.com

پر دراز ہو جاتا۔

ایک شام کو ذخیرے میں جانے سے پہلے وہ گاؤں کے عین وسط میں ایک تنگ و تاریک گلی میں سے گزرا۔ اس گلی میں چماروں کے تین گھر تھے جن سے ہر وقت کچے چمڑے اور گلی سڑی کھالوں کی بدبو آتی رہتی تھی۔ ان میں سے ایک گھر بالکل ویران پڑا تھا۔ دالان میں چند صاف اور چوکور پتھر پڑے تھے جن پر چمار چمڑا کوٹتے تھے۔ ان پر آدھ آدھ انچ گرد جمی ہوئی تھی۔ سرکنڈوں کا چھپر بارش کی وجہ سے نیچے جھک آیا تھا۔ صحن میں گاؤں کے آوارہ کتے کھیل رہے تھے اور کوٹھے کی منڈیروں پر بے شمار گلہریاں اپنی پھولی ہوئی دمیں اٹھائے ایک دوسرے کے پیچھے بھاگ رہی تھیں۔ ولی اس مکان کے قریب آکر رکا۔ اندر جھانکا۔ حیران کھڑا رہا' جیسے کوئی ملاح اپنی کشتی ڈبو کر کنارے پر بیٹھا اپنے تاریک مستقبل میں امید کی کرن ڈھونڈنے کی ناکام کوشش کرتا ہے۔ وہ صحن کے بوسیدہ چولہوں کے قریب جاکر بیٹھ گیا۔ ادھر ادھر ٹہلتا رہا اور پھر وہاں سے نکل کر سرکاری ذخیرے کو چل دیا جس کے ارد گرد دو دو تین تین کوس کے فاصلے پر بھولے دہقان بتیوں کے جلنے بجھنے' گیتوں کے گائے جانے اور گھنگھروؤں کی جھنکار کے منتظر تھے۔

اور اب اس گلی کے چکر کاٹنا بھی اس کا معمول ہو گیا۔

جب وہ نامراد انسان کے خیالات کی طرح بل کھاتے رستے پر چڑھنے لگتا اور ننھے ننھے کنکر اس کے قدموں تلے سے کھسک کر نیچے لڑھکتے اور جب درختوں کی جھکی ہوئی شاخوں سے اس کی پگڑی الجھ جاتی اور وہ اسے چھڑانے کے لیے رک جاتا۔ پھر جب درخت کی شاخوں کو ہلتا دیکھ کر آشیانوں سے چیلیں پھڑپھڑاتی ہوئی نکلتیں اور دور کسی چٹان یا اونچے درخت سے ٹکرا کر نیچے گر جاتیں تو فضا ایسی ہیئت اختیار کر لیتی جیسے ہر طرف ارواحِ خبیثہ کی بادشاہی ہے اور جیسے ان درختوں کی آڑ میں بھتنے آنکھ مچولی کھیل رہے ہیں اور کھیلتے کھیلتے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہواؤں میں اڑ جاتے ہیں! ولی کو لوگوں کے اس شبہ کو یقین میں بدلتے دیکھ کر کچھ نہ کچھ روحانی تسکین حاصل ہوتی کیونکہ دوسرے لوگوں کے احساسات سے کھیلنے کی لذت مرنے والے انسان کے دل میں بھی موجود ہوتی ہے۔ لیکن جب وہ واپس گاؤں آتا اور چوپال کی چھت پر سے کسی نوخیز لڑکے کے گانے کی آواز آتی۔

اَجے نہیں سَن پُھلیاں پھلیاں
ماہی توڑیاں آس دی کلیاں
(ابھی تک ان میں پھول پھل نہیں آئے تھے۔
ساجن نے میری آس کی کلیاں (قبل از وقت)
توڑلیں۔)

تو اس کے دل سے کچھ ایسی دردناک ہوک اٹھتی کہ وہ سینے کو دونوں ہاتھوں سے دبا کر بیٹھ جاتا' سر نہ اٹھاتا جب تک اس کے آنکھوں سے آنسو بہتے بہتے ختم نہ ہو جاتے!

جب وہ آنکھیں بند کر کے اپنے سرد بستر پر لیٹتا تو اس کی نظروں کے سامنے اندھیرا ایک خاص شکل اختیار کر کے ناچنے لگتا۔ وہ دیکھتا کہ اندھیرے کا سیلاب ایک وسیع دائرے میں تبدیل ہو گیا ہے اور یہ دائرہ حرکت میں ہے۔ اندھیرے پردوں کے پیچھے بانسریوں کی دھیمی لہریں بلند ہو رہی ہیں۔ اس اندھیرے سے بھی ایک گہرا سایہ بانسریوں کی آواز میں لپٹا ہوا آہستہ آہستہ ابھرتا اور اس دائرے کے گرد کچھ اس تیزی سے چکر کاٹتا کہ آسمان و زمین لامحدود فضا میں لڑھکتے محسوس ہوتے۔ یہ اندھیرا سایہ چکر کاٹتا ناچتا' گاتا بڑھنے لگتا' بڑھتا جاتا' بڑھتا جاتا' حتیٰ کہ اس کا سحر اس کے سارے احساسات پر چھا جاتا۔ وہ آنکھیں مل کر اٹھ بیٹھتا۔ آسمان پر ستارے انسان کی بے بضاعتی اور مضحکہ خیز خیال آرائی پر کھلکھلا کر ہنس پڑتے اور ولی فضا میں اس طرح ہاتھ گھمانے لگتا

www.iqbalkalmati.blogspot.com

جیسے ہوا میں کسی ٹھوس جسم کو چھونا چاہتا ہے!

دن کو بیلوں کے پیچھے پیچھے چلتے ہوئے جب ہل کی پھال سے کوئی جنگلی پھول کٹ کر پرے جا گرتا یا کوئی کیڑا مضطرب ہو کر کسی سوراخ سے نکلتا اور اپنا ننھا سا سر اٹھا کر اپنی خانہ ویرانی کا ماتم کرنے لگتا تو ولی بیلوں کو اس قدر پیٹتا کہ ان کی کمریں سوج جاتیں۔ وہ ان کی پیٹھ پر شیشم کی پتلی چھڑی جماتے ہوئی کہتا۔ "کمبختو' ذرا ادھر سے ہو کر گزر جاتے تو تمہارا کیا بگڑ جاتا۔ ابھی اس ننھی اودی کلی نے دنیا کا دیکھا ہی کیا تھا کہ تم نے اسی کو مسل کر خاک میں ملا دیا۔ اور اس ذرا سی جان نے تمہارا کیا قصور کیا تھا کہ اس کا گھر برباد کر کے آگے بڑھے جا رہے ہو ـــــ"

آس پاس ڈھیریوں پر چرواہے ولی کو اپنے آپ سے باتیں کرتا سنتے تو اکٹھے ہو جاتے اور دبی آواز میں کہتے۔ "ارے ولی کس سے بول رہا تھا؟"

"بیلوں سے!"

"پاگل ہو گیا ہے!"

"بیمار ہے بیچارا۔"

"پیر جی کے سلام کو نہیں جاتا۔"

"نماز نہیں پڑھتا۔"

"نقصان اٹھائے گا۔"

"مر جائے گا۔"

اگرچہ ولی ان کی باتیں نہ سن سکتا لیکن ان کو یوں سر جوڑے بیٹھا دیکھ کر اسے معلوم ہو جاتا کہ وہ اسی کے متعلق باتیں کر رہے ہیں اور انہوں نے اس کے متعلق کوئی اچھی رائے قائم نہیں کی۔

ایک روز وہ سویرے ہی ہل چلا کر گھر آگیا اور دل بہلانے کے لیے چوپال پر چلا گیا۔ بہت بڑا مجمع تھا۔ سرکاری ذخیرے کے بھوتوں کے متعلق بحث

www.iqbalkalmati.blogspot.com

چھڑی ہوئی تھی۔ ولی کو دیکھ کر ایک سفید ریش بزرگ بولا۔ "ولی آرہا ہے' اس سے پوچھو۔ چوکیدار کہہ رہا تھا کہ اکثر کالی راتوں کو ولی گاؤں کے باہر دور دور تک چکر کاٹتا رہتا ہے اور نہیں ڈرتا۔ کیا اس نے کبھی کچھ دیکھا یا سنا؟"

ولی ایک پتھر پر بیٹھ گیا اور بولا۔ "لوگوں سے تو یہ قصہ سن رکھا ہے۔ لیکن نہ اپنی آنکھوں سے کچھ دیکھا اور نہ کانوں سے کچھ سنا ہے۔ اگر کہو تو آج رات گھاٹی میں جاکر اس سارے "اسرار" کا حال معلوم کر آؤں۔ اگر کچھ چیز ہوئی تو مجھے دکھائی تو دے گی۔ ورنہ مفت میں مسافروں کو گھاٹی کے اس طرف روکے رکھنا اور گھروں سے ڈر کے مارے باہر قدم نہ رکھنا بہت بری بات ہے۔"

بڑے بوڑھوں نے اسے ایسے خوفناک اقدام سے روکا۔ اس کے دوستوں نے اس کی اس جرأت پر اظہارِ تعجب کیا اور سارے چوپال والے حیران ہونے لگے کہ انسان بھوتوں سے لڑنے کی کیسے جرأت کر سکتا ہے!

ایک بوڑھا بولا۔ "بیٹے ولی! اس مخلوق سے دور رہنا ہی بہتر ہے۔ کسی بھوت نے ہنسی مذاق میں ایک تھپڑ مار دیا تو مرتے دم تک چین نہ پاؤ گے۔ کسی نے بڑھ کر گردن مروڑ دی تو پھر لوگوں کا کیا بگڑے گا' ایک جوان بیوی کو بیوہ اور ایک معصوم بچے کو یتیم کر جاؤ گے۔ ایسا نہ کرنا۔ وہ بھوت ہم انسان' وہ آگ ہم خاک' ہمارا ان کا کیا مقابلہ۔"

لیکن ولی نے تو تہیہ کر لیا تھا کہ وہ آج سرکاری ذخیرے کے بھوتوں کو چھٹی کا دودھ یاد دلائے گا۔ وہ گھر واپس آیا۔ بوڑھی ماں اور نوجوان بیوی نے اس کے ہاتھ جوڑے' منتیں کیں کہ ادھر نہ جانا' ڈائنیں کلیجہ نکال کر چبا جاتی ہیں۔ اور پھر مرنے والے کے گھر پر دھاوا بول دیتی ہیں۔ لیکن ولی انکار کرتا رہا۔ وہ جی ہی جی میں لوگوں کی اس غلط فہمی پر مسکراتا رہا اور سوچتا رہا کہ ایک دو راتیں یہ سوانگ بند رکھے گا اور لوگوں کا تعجب بڑھانے کے لیے یہی سلسلہ

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ایک بار پھر سے چھیڑ دے گا۔ وہ اپنے غمزدہ دل کو ان لاحاصل مصروفیتوں میں ڈال کر بہلانا چاہتا تھا۔

اس شام وہ گھر سے نکل کر چماروں والی گلی کی طرف جانے لگا تو چوپال کے قریب اسے ایک نوجوان مموں ملا۔ اس نے پوچھا۔ ”ابھی تک نہیں گئے ولی؟ بھوت تمہارا انتظار کر رہے ہوں گے۔“

ولی صرف مسکرا دیا۔

مموں بولا۔ ”بھئی مذاق کی بات نہیں' ادھر نہ جانا۔ اب یہ فتو چمار کی لڑکی کا قصہ تو تم نے سنا ہو گا۔ لوگوں نے اسے بھی آدھی رات کو اس ذخیرے کی طرف جاتے دیکھا تھا۔ ایک روز ذرا دیر سے آئی اور بیمار پڑ گئی۔“

ولی نے کہا۔ ”لیکن اسے صرف بخار ہوا مگر پھر بدپرہیزی سے بڑھ گیا۔ اب چار ماہ سے سارا کنبہ جو لاہور کے بڑے ہسپتال میں ہے تو کسی امید پر ہی بیٹھا ہے نا۔ امید ہے چمارن اچھی ہو کر آئے گی۔“

مموں نے متعجب ہو کر کہا۔ ”اچھی ہو کر آئے گی!—— تمہیں ابھی تک معلوم نہیں کیا؟ چمار ابھی ابھی چوپال سے دس بارہ آدمی بلا کر لے گئے ہیں۔ اسٹیشن پر چمارن کی لاش آئی ہوئی ہے' وہ اسے اٹھانے گئے ہیں۔“

ولی کے لبوں سے ایک پھنکار سی بلند ہوئی۔ ”وہ بیچاری —— مر گئی؟“

وہ سر جھکائے خاموش سیدھا ذخیرے کی طرف چل دیا۔

\# ساری رات لوگ اس کی واپسی کے منتظر رہے۔ اس رات نہ بتیاں جلیں نہ گیت گائے گئے' نہ کنکر لڑھکے' نہ چیلیں اڑیں' نہ گھنگرو جھنجھنائے اور نہ ناچ ہوا۔ ایک اداس سا سناٹا ہر طرف منڈلاتا رہا۔ سورج کے طلوع ہوتے ہی ولی کی ماں اور بیوی کی چیخ پکار سے مجبور ہو کر دس بارہ نوجوان گھاٹی کی طرف دوڑے۔ جب وہ چوٹیوں پر پہنچے اور نیچے گھاٹی میں جھانکنے لگے تو دور

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بہت نیچے، چشمے کے کنارے انہیں ولی کا بے حس و حرکت جسم نظر آیا ——— اور گھاٹی میں خاموشی گونج رہی تھی!

"ولی، ولی، ولی محمد۔ او ولی محمد! ———" وہ چیخنے لگے اور آس پاس بھیانک سیاہ چٹانیں ان کی آوازیں دہرانے لگیں۔ بھوت ان کا مذاق اڑا رہے تھے۔ اچانک ایک جھاڑی پر سے ایک چڑیا اڑی اور چشمے پر پانی پینے لگی۔ پھر اڑ کر ولی محمد کے پیٹ پر بیٹھ گئی۔ پھدکتی پھری، ناچتی رہی اور آخر پھر سے اڑی اور اوپر ہی اوپر اٹھنے لگی۔ نوجوان بھوت، بھوت پکارتے پاگلوں کی طرح گاؤں کی طرف بھاگے اور جب چوپال پر پہنچے تو دور سے انہوں نے ایک مجمع دیکھا، جو چمارن کی لاش اٹھائے گاؤں میں داخل ہو رہا تھا۔ ———!

✿

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ننھے نے سلیٹ خریدی

ننھا عزیز سر پر ایک میلا بستہ رکھے تھکے تھکے قدم اٹھاتا' ہولے ہولے گنگناتا آ رہا تھا۔

تعریف اس خدا کی جس نے جہاں بنایا
کیسی زمیں بنائی کیا آسماں بنایا

اس نے اچانک قدم روک لیے اور زمین کو بڑی سنجیدگی سے دیکھنے لگا۔ پھر بستے کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر اوپر دیکھا——— ہلکا نیلا آسمان جس پر دو چار چیلیں منڈلا رہی تھیں۔ اس نے مسکرانے کی کوشش کی مگر مسکراہٹ پر حیرت نے فتح پالی!

کیسی زمیں بنائی! کیا آسماں بنایا!!

وہ اپنی انگلی دانتوں میں دابے کچھ سوچتا ہوا قدم اٹھانے لگا۔ ایک دوبار مویشیوں کے گلّوں نے اسے تکلیف دی اور وہ ایک طرف دیوار سے چمٹ کر ہر بیل کو خوف سے گھور گھور کر دیکھنے لگا۔ اچانک اس کی نگاہیں ایک جوان بیل کے مرمر ایسے سفید سموں پر جم گئیں اور پھر اس نے اپنے میلے کچیلے پاؤں کی طرف دیکھا جو پرانی چپل میں مردہ چوہوں کی طرح پڑے تھے۔ میل

www.iqbalkalmati.blogspot.com

سے بھرے ہوئے' بے جان اور بدصورت! اس کے ذرا سے دماغ نے ایک بہت بڑی تجویز سوچی۔ اگر مجھے اللہ میاں کہیں ملیں تو میں پہلے انہیں سلام کر کے (کیونکہ ماسٹرجی نے بڑوں کو سلام کرنے کی زبردست تلقین کر رکھی تھی) یہ عرض کروں گا۔ "اچھے اللہ' انسان کے پاؤں بڑے خراب ہیں۔ انسان چلتا پھرتا ہے' بھاگتا دوڑتا ہے تو اس کے پاؤں میں کنکر کانٹے چبھ جاتے ہیں۔ میل جم جاتا ہے! کئی بار زخمی ہو جاتے ہیں پاؤں-اگر یہ بیلوں کے سموں کی طرح ہڈی کے بنے ہوئے ہوں تو کیا ہرج ہے" ——— وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ سامنے سے اسے گاؤں کا سب سے بڑا رئیس مشکی گھوڑے پر سوار نظر آیا۔ اس کی گرگابی سورج کی شعاعوں میں شیشے کی طرح چمک رہی تھی اور جب وہ عزیز کے پاس سے گزرا تو آپ سے آپ عزیز کی نگاہیں اس کے پاؤں پر جم گئیں جو دودھ کی طرف سفید تھے۔ اس نے آسمان کی طرف دیکھا جیسے خدا سے اپنی غلط دعا واپس مانگ رہا ہے۔ اتنے اچھے' ایسے صاف پاؤں! سم کیا شے ہے ان کے مقابلے میں! مگر میں بھی تو ایک انسان کا بیٹا ہوں۔ میرے پاؤں اتنے غلیظ کیوں ہیں! یہ الٹی بات اس کی سمجھ میں نہ آتی تھی۔

وہ اس سوچ میں غرق آہستہ آہستہ جا رہا تھا کہ اچانک اسے راستے میں ابھرے ہوئے ایک پتھر سے ٹھوکر لگی۔ بستہ اچھل کر دور کنکروں پر جا گرا اور اس کے دائیں پاؤں کے انگوٹھے سے خون جاری ہو گیا۔ اسے پھر ایک ثانیہ کے لیے بیل کے سموں کے فوائد کا خیال آیا مگر درد کی شدت نے اس کے دماغ میں ہلچل مچا دی۔ اس نے چیخ کر رونا چاہا مگر سامنے سکول کے برآمدے میں ماسٹر جی کھڑے ہاتھوں میں کھڑیا مٹی کا ایک ٹکڑا اچھال رہے تھے۔ اس کی چیخ حلق تک آئی اور وہ کڑوی دوا کی طرح آنکھیں بند کر کے پی گیا۔ زخم پر مٹی ڈال کر اٹھا۔ بستے کو چھوا تو اس کا دل دھک سے اس کی ایڑیوں میں جا گرا ——— اس کی سلیٹ ٹوٹ گئی تھی۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

وہ ضبط نہ کر سکا اور پورے زور سے رونے لگا۔ ماسٹر جی بڑے رحم دل تھے۔ دوڑے دوڑے آئے۔ ننھے کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "چپ! اٹھ' میں آج تجھے کچھ نہ کہوں گا۔ آج کاغذ پر سوال حل کر لینا۔ کل سلیٹ خرید لانا۔ اور ہاں اب لوہے کی سلیٹ خریدنا جیسے اصغر کی ہے۔"

جیسے اصغر کی! عزیز نے سوچا' مگر اصغر کا باپ تو پٹواریوں کا بڑا افسر ہے اور میرا باپ پٹواری اور جنگل کے داروغے کی گائے بکریوں کے لیے چارہ کاٹنے والا! لوہے کی سلیٹ پر تو بڑے پیسے خرچ آئیں گے اور کل رات ہم لوگ پیسے نہ ہونے کی وجہ سے بھینسے کا گوشت نہ خرید سکے! ——— اب کیا ہو گا!

اس نے بستہ سر پر اٹھایا۔ غیر ارادی طور پر اس کی انگلیاں بستے کے اندر کھڑکھڑاتے ہوئے سلیٹ کے ٹکڑوں کو ٹٹولنے لگیں۔ اور جب وہ لڑکوں کے جمگھٹ میں داخل ہوا جو اس کی چیخیں سن کر اسکول کے احاطے کے باہر اکٹھے ہو گئے تھے تو اس کا چہرہ فخر سے لال ہو گیا۔ ماسٹر جی اس کی انگلیاں تھامے ہوئے تھے!! اور لڑکے بھی اس کی طرف ہمدردانہ نگاہوں سے دیکھ رہے تھے کیونکہ ماسٹر جی نے اس سے ہمدردی کی تھی۔

چٹائی پر بیٹھ کر اس نے بستے سے سلیٹ کے ٹکڑے یوں نکالے' جیسے اپنے سینے سے دل کے ٹکڑے نکال رہا ہے۔ ایک ٹکڑا اپنے پاس رکھ لیا اور باقی دور ایک جھاڑی میں پھینک آیا۔ ماسٹر جی سوال لکھانے لگے تو پہلے تو اس نے سلیٹ کی طرف دیکھا جس کے بیشمار کنارے چاقو کی دھار کی طرح تیز تھے۔ پھر پیچھے مڑ کر قطار کے آخری سرے پر اصغر کی سلیٹ کی طرف دیکھا۔ نئی سلیٹ کے ساتھ ایک مٹھی بھر اسفنج لٹک رہا تھا۔ اس نے نفرت سے اپنی ننھی سی ناک چڑھا کر اپنی سلیٹ پر زور سے تھوکا اور ہتھیلی سے مل کر سوال حل کرنے لگا۔

چھٹی کے بعد وہ گھر واپس آ رہا تھا۔ اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اور پھر ہر رونگٹے کی جڑ سے پسینہ پھوٹ نکلا۔ سلیٹ کے ٹکڑے کے تیز کنارے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اس کے دماغ کو چیرنے لگے۔

باپ نے پوچھا۔ "بیٹا چھٹی ہو گئی؟"

"ہاں ابا"——— ابا کہتے وقت اس کا حلق گھٹ گیا لیکن کھانسی کا بہانہ کر لیا اور پھر اس غیر متوقع کامیابی پر جی ہی جی میں خوش ہونے لگا۔

"گھر جا کر سلیٹ پر خوب سوال حل کرنا۔"

"سلیٹ تو ٹوٹ گئی ہے———" اس نے یہ جواب دینا چاہا۔ لیکن اس کی نظر باپ کے بھاری اور کھردرے ہاتھ پر پڑ گئی جو اس کے گال پر پڑتا ہے تو اسے دن کے وقت بھی نیلے پیلے تارے نظر آنے لگتے تھے اس لیے وہ خاموش رہا۔

اس کے باپ نے پیچھے مڑتے ہوئے کہا۔ "سنا؟"

"ہاں"

اس کا باپ پٹواری کے گھر کی طرف چلا گیا اور وہ اپنے گھر آیا۔ ماں کو دیکھ کر اس کا جی بھر آیا' آنسو امڈ آئے اور وہ زار زار رونے لگا۔

"کیوں میرے بچے' تیرے دشمن روئیں تو کبھی نہ روئے۔ تو کبھی نہ روئے میرے بچے' کیا بات ہے؟" یہ کہتے ہوئے ماں بڑے محبت سے اس کے سر اور گالوں پر ہاتھ پھیرنے لگی۔

"ماں میری سلیٹ ٹوٹ گئی۔"

اس کی ماں دھم سے دیوار سے پیٹھ لگا کر بیٹھ گئی جیسے اس کا نالائق بیٹا عمر بھر کی کمائی دریا میں بہا آیا ہے۔

عزیز نے روتے ہوئے اپنی باچھوں کو پوری قوت سے ٹھوڑی کی طرف کھینچتے ہوئے کہا۔ "ماں ابا کو نہ بتانا۔"

ماں نے اپنے کنگن کو مضطربانہ اپنی کلائی میں گھماتے ہوئے پوچھا۔ "تو پھر کیا سر پہ نکالے گا سوال؟"

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اور عزیز سوچنے لگا کہ اگر سر پر سوال نکالے جا سکتے تو وہ روتا ہی کیوں! اس کی ماں کتنی بھولی ہے! آخر ان پڑھ ہے نا۔ پڑھی لکھی ہوتی تو اسے معلوم ہوتا کہ سوال سر پر نہیں صرف سلیٹ پر نکالے جا سکتے ہیں!

اس دن نہ اس نے ماں سے گڑ مانگا نہ جوار کے ہلکے پھلکے مرنڈے! نہ کبڈی کھیلا نہ آنکھ مچولی! اس کے ہمجولی اس کے پاس اکٹھے ہو گئے اور مجبور کرنے لگے کہ باہر چلو لیکن ایک سیانا لڑکا پیچھے سے مجمع کو چیرتا ہوا آیا اور بولا۔ "ارے یار جیجے کو مت چھیڑو۔ اس کی سلیٹ ٹوٹ گئی ہے!" عزیز کے دل پر جیسے کسی نے من بھر ہتھوڑا جما دیا۔ کانپ کر اٹھا کہ کہیں باپ تو نہیں آ گیا۔ لیکن بیل چارے کے انتظار میں کان کھڑے کئے دروازے کی طرف دیکھ رہے تھے اور ماں چولھے کے پاس بیٹھی ٹین کے پترے سے ساگ کتر رہی تھی۔

بس وہ چارپائی پر پڑا رہا اور کچھوے خرگوش کی کہانی پڑھتا رہا۔ اسے خرگوش پر کئی بار غصہ آیا۔ "کتنا غافل تھا خرگوش! ٹھیک اس طرح جیسے ——— جیسے ——— جیسے ———" اسے کوئی مثال نہ مل سکی۔ اچانک اس کی اداس آنکھیں چمک اٹھیں ——— "جیسے میں!" اور پھر اسے اپنے آپ پر اتنا غصہ آیا کہ جی میں آئی ابھی اپنے آپ کو قبر میں دفن کر دے اور اپنی موت پر ایک آنسو تک نہ بہائے اور پھر خوشی خوشی سکول ———! اس کا دماغ گھومنے لگا۔ جتنا خیالات کا سلسلہ بڑھتا جاتا تھا اس کی وحشت میں اضافہ ہوتا جاتا تھا۔ اور جب اندھیرا بڑھنے لگا اور اس کی ماں پکاری۔ "جیجے ادھر آ۔ روٹی ٹھنڈی ہو رہی ہے۔" تو بے اختیار اس کے منہ سے یہ الفاظ نکل گئے۔ "میری سلیٹ جو ٹوٹ گئی!"

"کب؟" مگر یہ ماں کی آواز نہ تھی۔

اس نے سامنے دیکھا۔ اس کا باپ بڑی بڑی آنکھیں نکالے اس کی طرف بڑھا آ رہا تھا۔ "کب توڑی؟"

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اس نے اپنے آپ کو قبر میں دفن کرنے کی تجویز پر پھر غور کرنا چاہا مگر باپ کے تھپڑ نے اس کے خیالات کو بری طرح منتشر کر دیا اور وہ اتنا رویا ـــــ اتنا رویا کہ آخر اسے رونے میں لطف آنے لگا۔ وہ اپنا رونا بند نہیں کرنا چاہتا تھا۔ کیونکہ اس طرح ماں کی تسلیوں کے رک جانے کا اندیشہ تھا۔

"چپ کرتا ہے یا لگاؤں ایک اور؟" ـــــ اور اس کی آواز ایک دم رک گئی۔

"سلیٹ بھی توڑ آیا اور ریں ریں بھی کئے جاتا ہے ـــــ اندھا ـــــ اندھے تُو سامنے دیکھ کر کیوں نہیں چلتا؟ ـــــ ہیں؟ ـــــ یہ ہمیشہ تیری نظر آسمانوں پر کیوں رہتی ہے؟ جیسے اللہ میاں سے باتیں ہو رہی ہیں! ـــــ اندھا ـــــ تو تو مجذوب ہے!"

مجذوب! ـــــ کتنی بڑی گالی دی ہے ابا نے۔ ابا کی جگہ کوئی اور ہوتا تو میں اسے اٹھارہ بار مجذوب کہہ ڈالتا۔

اور جب اس کا باپ اٹھ کر چوپال کو چلا گیا تو اس نے ماں سے نہایت رازدرانہ لہجے میں پوچھا۔ "ماں مجذوب کسے کہتے ہیں؟"

"جسے اللہ میاں کے سوا کسی کا خیال نہ ہو ـــــ یعنی اللہ میاں کا دوست!" ـــــ اور عزیز سوچنے لگا کہ کیا اللہ میاں کا دوست ہونا بہت بری بات ہے؟

وہ صبح اٹھا تو باپ اس کے سرہانے کھڑا تھا۔ "اٹھتا بھی ہے اب کہ جماؤں ایک؟ ـــــ لے یہ چونی۔ تیری خاطر دس آدمیوں کی داڑھیوں کو ہاتھ لگانا پڑا۔ ابھی قصبے سے جا کر سلیٹ خرید لا۔ اسکول کے وقت آجائیو! سمجھے؟"

عزیز نے چارپائی سے اٹھ کر زمین پر قدم دھرا تو اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کا دل اس کی پسلیوں تلے ناچ رہا ہے اور اس کی آواز کے ساتھ اس کے ہونٹ کانپ رہے ہیں۔ آنکھیں آپ ہی آپ جھپکی جا رہی ہیں۔ نتھنے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

پھڑک رہے ہیں رگ رگ دھڑک رہی ہے۔ وہ باپ سے چونی چھین کر دوڑا ہی تھا کہ ایک آواز سنائی دی۔ "اے مجذوب! جوتا تو پہنتا جا۔ تیرا تو سر پھر گیا ہے!" اس نے مڑنے سے پہلے اپنے سر پر ہاتھ پھیرا۔ اس کا خیال تھا اس کا چہرہ پیٹھ کی طرف مڑ گیا ہے——باپ کے تھپڑ کی وجہ سے! آخر سر پھرنے کا اور کیا مطلب ہے؟ اور جب اسے تسلی ہو گئی کہ وہ اپنی پرانی حالت پر قائم ہے تو اسے تعجب ہونے لگا کہ اس کا باپ اتنے جھوٹ کیوں بولتا ہے؟

وہ جوتا پہن کر بھاگا۔ قصبہ وہاں سے ایک میل دور تھا۔ چونی اس کی قمیض تلے پہنی ہوئی پرانی سیاہ صوف کی واسکٹ کی جیب میں تھی۔ جسے اس نے مضبوطی سے ہاتھ میں دبا رکھا تھا۔ ایک بار اس نے چونی کے گول گول کونوں کو ٹٹولا۔ چونی اس کی جیب میں موجود تھی اور نئی سلیٹ قصبے کی ایک دوکان میں اس کی منتظر! ایک جگہ وہ قدرے ستانے کے لیے بیٹھ گیا۔ اچانک سامنے جھاڑی سے اصغر نکلا۔ اس کے ہاتھ میں اپنی نئی سلیٹ تھی جس کے ساتھ مٹھی بھر اسفنج لٹک رہا تھا۔ اصغر نے اپنی سلیٹ کو فخریہ انداز سے ہوا میں گھمایا اور عزیز نے محسوس کیا کہ اس کے ہاتھ میں بھی نئی سلیٹ ہے جو ٹین کی طرح بجتی ہے اور جس کے ساتھ ماسٹر جی کی ناک جتنا اسفنج لٹک رہا ہے (ماسٹر جی کی ناک عزیز کی مٹھی سے بڑی تھی!) اصغر کی آنکھیں جھک گئیں اور وہ پلٹ کر پھر جھاڑی میں گم ہو گیا!۔ کتنا پیارا خیال! کیسا سندر سپنا! وہ کھلکھلا کر ہنس پڑا اور پھر دوڑنا شروع کر دیا۔ قصبے کے تنگ و تاریک بازار کی دکانیں کھل چکی تھیں۔ وہ سلیٹوں والی دکان کو خوب پہچانتا تھا۔

دکاندار موٹا سا تھا۔ اس نے اپنی ڈھیلی ڈھالی توند اپنے گھٹنوں پر پھیلا رکھی تھی۔ وہ صرف ایک دھوتی باندھے ہوئے تھا۔

عزیز ہانپتے ہانپتے اس کے پاس گیا۔

"سلیٹیں ہیں؟" یہ سوال اس نے اس انداز سے پوچھا گویا وہ ساری

www.iqbalkalmati.blogspot.com

دکان خریدنے آیا ہے۔

دکاندار نے اپنی ناف پر سے بھنبھناتی مکھیاں اڑاتے ہوئے جواب دیا۔

"ہاں"

"دکھاؤ۔"

دکاندار نے اپنے بازو زمین پر ٹیک کر اٹھنے کی کوشش کی اور بہت دیر تک اسی حالت میں ہانپتا رہا۔ عزیز پکارا۔

"لالہ جی۔"

"ہاں بھائی ہاں۔" دکاندار اٹھ کھڑا ہوا اور عزیز کے سامنے دس پندرہ سلیٹیں رکھ دیں۔

"لوہے کی ہیں؟"

"سب لوہے کی ہیں۔"

"دام۔"

"تین آنے!"

ایک آنہ بچ گیا۔ عزیز کے گال تمتمانے لگے۔ اس کی ننھی سی ناک پر، اس کی کھلے سفید ماتھے پر، اس کے بھرے بھرے سے نچلے ہونٹ کے تلے پسینہ پھوٹ آیا۔ اسے محسوس ہوا جیسے وہ ابھی یہاں سے دکان سمیت ہوا میں اڑ جائے گا۔

"اسفنج ہیں؟"

"ہاں۔"

"سب سے بڑے اسفنج کے دام؟"

"چار پیسے"

"عزیز خوشی سے ناچنا چاہتا تھا۔ ایک بار تو اس کے جی میں آئی کہ دکاندار سے لپٹ کر گائے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

تعریف اس خدا کی جس نے جہاں بنایا

لیکن اس کی توند دیکھ کر اس کی نظر اپنے پیٹ پر جا پڑی۔ جو ریڑھ کی ہڈی سے چمٹ کر رہ گیا تھا۔ ایک لمحے کے لیے وہ مسکرانا تک بھول گیا اور آخر بولا۔

"تو لا یہ سلیٹ اور ایک بڑا اسفنج!"

دونوں چیزیں اپنے قریب کھسکا کر اس نے قمیض اٹھائی اور واسکٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ اس کی دو انگلیاں جیب سے باہر نکل گئیں۔ چونی راستے میں گر گئی تھی!

✿

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بچپنہ

اس وقت میری عمر یہی کوئی پانچ چھ برس کی ہوگی۔ شہتوت کے درختوں پر لمبے لمبے رس بھرے شہتوت لٹک رہے تھے جیسے وہ صرف میرے ہی حلق سے اترنے کے لیے بیتاب ہیں۔ منہ میں پانی بھر آیا۔ لنگوٹا کھینچ تنے سے جو چمٹا ہوں اور اپنے ہمجولیوں کی "شاباش" "شاباش"۔ کے نعروں کے سہارے جو اوپر چڑھنے لگا ہوں تو میں یہ سوچنا ہی بھول گیا کہ شہتوت کے درخت ایک جگہ جاکر ختم بھی ہو جاتے ہیں' منہ اٹھا کر اوپر جو دیکھا تو صرف ایک نازک سی کونپل اپنے چوڑے پتے تھرتھراتی نظر آئی اور اس سے پرے صاف نیلا آسمان' ــــــ اور نیچے.......

نیچے دیکھتے ہی میرے اوسان خطا ہو گئے۔ گنجان پتوں سے میری نگاہیں نہ چھن سکیں۔ لمبے لمبے رس بھرے شہتوت مجھے زہریلے کیڑوں کی طرح ٹہنیوں سے لٹکے دکھائی دینے لگے۔ ــــــ اب اترے کون! ہاتھ پیر پھول گئے۔ حلق خشک ہو کر کڑوا سا محسوس ہونے لگا جیسے بے جانے بوجھے کونین کی گولی چبالی ہو۔ روئیں روئیں سے پسینہ پھوٹ نکلا اور خوف و دہشت کی دھند میں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

مجھے تعجب ہونے لگا کہ میں یہاں تک چڑھا کیسے؟ جس ٹہنی سے میں چمٹا ہوا تھا وہ دوسری ٹہنیوں سے یوں الگ تھلگ کھڑی تھی جیسے امیر لڑکوں کے مجمع میں ایک مفلس چھوکری۔ پھیپھڑوں کی پوری قوت اور گلے کے پورے پھیلاؤ سے کام لے کر میں پکارا۔ "بھائی عبداللہ!"

اور نیچے میرے خلیرے بھائی عبد اللہ نے آواز دی۔ "کب کے ہم لوگ چادریں پھیلائے کھڑے ہیں۔ کوئی ٹہنی وہنی جھٹکاؤ۔ اوپر بیٹھے اکیلے ہی شہتوت نگلے جا رہے ہو!"

کلیجے پر جیسے کسی نے مرچیں چھڑک دی ہوں! میں چیخ اٹھا۔ "ارے میں اتروں کیسے؟"

اور عبد اللہ بولا۔ "جیسے چڑھا ہے' ویسے ہی اتر آ —— لیکن اترنے سے پہلے تو نے ٹہنیاں نہ جھٹکائیں تو ہم مار مار کر الو بنا دیں گے تجھے —— بلی کی طرح اوپر چڑھتا چلا گیا۔ اب گلہری کی طرح نیچے اتر آ!"

اور میں رونے لگا۔ "قسم خدا کی' میں گر جاؤں گا۔ میں یہاں بہت اونچا چڑھ آیا ہوں۔"

دور جا کر عبد اللہ اور دوسرے ساتھیوں نے جو دیکھا تو آپس میں چہ میگوئیاں کرنے لگے اور پھر ہدایات کا طوفان شروع ہو گیا۔ "ارے لٹک کر نیچے والی ٹہنی پر انگوٹھے ٹکا دے۔ اور جب تک انگوٹھے اچھی طرح نہ ٹک جائیں اوپر سے ہاتھ نہ چھوڑیو! اور دیکھو نیچے والی ٹہنی پر بہت زور نہ دیجیو ورنہ ٹوٹ جائے گی —— بہت کمزور دکھتی ہے!"

آنکھ کے ایک پلکارے میں مَیں نے ہزار بار ارادہ کیا کہ نیچے لٹک جاؤں۔ لیکن نیچے والی ٹہنی مجھے اتنی دور دکھائی دیتی کہ خوف سے میری ہتھیلیوں اور پاؤں کے تلووں سے آگ سی نکلنے لگتی۔ آخر اللہ کا نام لے کر میں جونہی لٹکا ہوں اور انگوٹھوں کو نیچے والی ٹہنی پر جمایا ہے کہ تڑاخ کی آواز آئی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اور میں موٹی موٹی ٹہنیوں سے ٹکراتا' پتوں کے پردوں کو پھاڑتا دھب سے نیچے آگرا۔ کہتے ہیں میں بہت دیر تک بیہوش رہا۔ پورے دو مہینے ہسپتال میں رہا اور جب وہاں سے نکلا تو ڈاکٹروں نے صرف اتنا کہا کہ ویسے تو ننھا بالکل اچھا ہے' صرف دماغ پر ضرب آئی ہے۔ اس کا اثر زندگی بھر زائل نہ ہوگا۔ اس کی پوری نگرانی کی جائے۔

میری نگرانی یوں ہونے لگی کہ مجھے گھر سے باہر قدم رکھنے کی اجازت نہ تھی۔ گلی ڈنڈا کھیلو تو گھر کی چار دیواری میں! چھپن چھوت کا شوق ہو تو اپنے مکانوں میں چھپتے پھرو۔ کبڈی کی دھن سمائے تو اپنے دارے میں ہی خاک اڑاؤ ——— چند روز تو طبیعت میں بے چینی سی رہی۔ چاندنی راتوں میں جب لڑکے باہر کھیتوں میں کبڈی کھیلتے اور ان کی مسرت بھری چیخوں کی گونج میرے کانوں کے پردوں سے ٹکراتی تو میں بیتاب ہو کر پلنگ پر بیٹھ جاتا۔

"امی مجھے جانے دو" ——— اور امی مجھے ہولے سے تھپکا کر کہتیں!

"نہیں نہیں میرے ننھے آج کل' سانپ اور بچھو اور کنکھجورے اور ——— جن بھوت گلیوں میں رینگتے پھرتے ہیں ——— اتنے اتنے لمبے سانپ اور یہ یہ بچھو! اور میری انگلیوں جتنے لمبے کنکھجورے اور ——— اور اس بیری جتنے اونچے بھوت ——— کھا جاتے ہیں کبڈی کھیلنے والوں کو!"

اور میں دہشت زدہ ہو کر کہتا۔ "لیکن باہر دوسرے لڑکے ———"

"یہ لڑکے! امی کے ہاتھ کی تھپک تیز ہو جاتی۔ "یہ لڑکے تو چڑیلوں کے بچے ہیں اور تم اپنی امی کے لال۔"

طفلی کی منطق کا پیٹ بہت مشکل سے بھرتا ہے۔ میں کہتا۔ "لیکن عبداللہ بھی تو ان میں شامل ہے۔ پھر خالہ اماں بھی چڑیل ———"

میرے منہ پر ماں کا ہاتھ چمٹ جاتا۔ "وہ ——— وہ ——— عبداللہ! اس پگلے کی یہ آوارہ مزاجی کبھی رنگ لائے گی۔"

www.iqbalkalmati.blogspot.com

لیکن گھر کی چار دیواری میں ساری کائنات سمٹ آئی۔ صحن میں گلی ڈنڈا کھیلتا رہتا اور جب گلی چار دیواری سے اچھل کر پرے جا گرتی تو کھیل ختم ہو جاتا۔ امی کا حکم تھا کہ ڈیوڑھی کے دروازے سے باہر ایک چڑیل بیٹھی رہتی ہے جس کے لمبے لمبے دانت ہیں' الٹے پاؤں ہیں اور ماتھے پر صرف ایک پاؤ بھر کی آنکھ ہے۔ اگر تو باہر گیا تو دبوچ لے گی تجھے! میں کہتا۔ "مگر ابھی ابھی تم بھی تو باہر گئی تھیں۔ پھر چڑیل نے تمہیں کیوں نہ چھیڑا؟" ——— وہ جواب دیتیں۔ "اسے صرف تجھ سے ضد ہے۔ خبردار باہر جانے کا نام تک نہ لینا۔"

میرے دل میں خلش سی رہتی۔ کہ یہ چڑیل صرف میرے پیچھے کیوں پڑ گئی ہے۔ میں ایک بار چپکے سے ڈیوڑھی کے باہر جھانک بھی آیا لیکن چڑیل مجھے نظر نہ آئی۔ اور پھر امی نے بتایا کہ چڑیلیں نظر نہیں آیا کرتیں!

ایک بار میں ایک کمرے میں بیٹھا تیسری جماعت کی کتاب پڑھ رہا تھا کہ دوسرے کمرے میں مجھے امی اور ابا کی باتیں سنائی دیں۔ امی کہہ رہی تھیں۔ "اب ننھے کی یہ قید کب تک رہے گی؟ خیر سے خاصا سیانا ہو گیا ہے۔ تم نے ڈاکٹروں کی بات یوں پلے باندھ لی ہے جیسے اس ڈیوڑھی سے باہر اس کے لیے خدانہ کرے' کوئی کھائی کھدی ہوئی ہے!"

اور ابا نے کہا۔ "باہر نکل کر اگر وہ الٹی سیدھی بات کر بیٹھا تو الزام مجھی پر آئے گا۔ ڈاکٹر میرا ہی منہ نوچیں گے۔ تم بھی مجھی پر انگلی دھروگی۔ اس کا دماغ نت نئی باتیں سوچتا ہے۔ ابھی کل ہی دیوار میں دو گز اونچی کیل ٹھونک کر اور اس پر جوتا رکھ کر اسے گرانے کی کوشش کر رہا تھا!"

اور امی بولیں "لیکن شاید تم بھول گئے ہو کہ اپنے وقت میں تم نے ایک خاصے اونچے مکان کی منڈیر پر سے پاؤں مار کر جوتا گرا لیا تھا۔ لوگ کہتے رہے کہ گردن توڑ بیٹھے گا اور تم ہرن کی طرف قلانچیں بھرتے لپکے' دیوار پر دو ڈگ بھرے اور جوتا ہوا میں اچھل گیا۔ میں ایک کوٹھے سے تمہیں دیکھ رہی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

تھی۔ یاد ہے نا؟"

"لیکن میں شہتوت کے درخت سے نہیں گرا تھا۔" ابا ہنس پڑے۔

اور امی تنگ آکر کہنے لگیں۔ "تو پڑا سڑنے دو بیچارے کو۔ تم بوڑھے ہو گئے تو کمائے گا کون؟ آسمانوں سے ہمارے لیے من و سلویٰ اترنے سے تو رہا۔ عقل کے ناخن لو۔"

اور دوسرے تیسرے روز مجھے سکول بھیج دیا گیا۔ میری ذہانت کی دھاک بندھ گئی۔ پہلی جماعت کا طالبعلم ہوتے ہوئے میں تیسری اور چوتھی جماعت کی کتابیں فرفر پڑھنے لگا۔ چوتھی اور پھر آٹھویں میں وظیفہ حاصل کیا اور دسویں جماعت کا امتحان نزدیک تھا تو ابا چل بسے۔

آنکھوں سے آنسو خشک ہوئے تو چار طرف کہر سا اتر آیا۔ مستقبل کا ہیولیٰ غول بیابانی کی طرح میرے خیالات کے اردگرد منڈلانے لگا۔ گھر میں گوشت کے بجائے دال پکنے لگی! دودھ کی بجائے چھاچھ ملنے لگی! گائے بک گئی تو چھاچھ کی جگہ تالاب کے گدلے پانی نے لے لی' سکول میں فیس کی معافی کی درخواست دی اور نامنظور ہوئی۔ نام کٹا کر گھر آگیا۔ عزیزوں سے قرضہ مانگا کہ دکان کھول لوں مگر ہر طرف سے ٹکا سا جواب ملا۔ مزدوری کرنے سے جی ڈرتا تھا کہ خاندانی عزت کا پاس تھا ــــــ تھک ہار کر بیٹھ رہا۔

سردیوں کا موسم تھا' امی انگیٹھی میں بجھتے ہوئے اپلے رکھ کر اندر لے آئیں اور کہنے لگیں۔ "لو' اترو کھاٹ سے اور ہاتھ پیر تاپ لو۔ بلا کا جاڑا پڑ رہا ہے۔!"

میں نے کھاٹ سے اترتے ہوئے مایوسانہ لہجے میں کہا۔ "لیکن امی۔ یہ اپلے تو ابھی راکھ بن جائیں گے۔"

امی کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ بولیں۔ "تو کہاں سے لاؤں میں پتھر کے کوئلے کہ رات بھر جلتے رہیں۔ تیرا ابا رقم جمع کرنا تو جانتا ہی نہ تھا۔ تو الگ ہاتھ

www.iqbalkalmati.blogspot.com

پیر توڑ کر بیٹھا ہے۔ ادھر شہروں کی طرف نکل جا۔ کہتے ہیں وہاں پڑھے ہوؤں کی ضرورت رہتی ہے اور اللہ رکھے' تو تو نو جماعتیں پاس کر چکا ہے۔"

امی مجھ سے تھک چکی تھیں۔ ان کی ماتا میں مجھے شک نہیں لیکن بیروز گار تو خدا کو بھی نہیں بھاتا۔ اور امی تو آخر انسان تھیں۔ میں نے اس رات شہروں میں جا کر قسمت آزمائی کرنے کا تہیہ کر لیا۔ اور جب امی کو اس ارادے سے آگاہ کیا تو وہ خاموش ہو گئیں۔ بہت دیر تک چپ رہنے کے بعد رونے لگیں! میں نے تسلیاں دیں تو بولیں۔ "لیکن بیٹا مجھے یاد رکھنا۔ بھول نہ جانا مجھے۔ ڈاکٹر کہتے تھے کہ ——" ان کی آواز بھرا گئی!

"جہنم میں جائیں دنیا بھر کے ڈاکٹر۔" میں نے تنگ آکر کہا۔ "ایکبار شہتوت کے درخت سے گرا اور ابھی تک اس چوٹ کا قصہ چلا آتا ہے۔ میں بھلا چنگا ہوں۔ تم میری ماں ہو۔ مجھے پالنے پوسنے والی۔ مجھے پروان چڑھانے والی۔ میں تمہیں کیسے بھول سکتا ہوں۔ امی تم تو بھولی ہو!"

اور امی نے میری گردن چوم لی۔

دوسرے دن پانچ روپے لے کر گاڑی پر سوار ہوا اور راولپنڈی جا نکلا۔ یہاں پولیس کے انسپکٹر صاحب کے ہاں ایک کام مل گیا۔ ان کا ایک بچہ دوسری اور ایک تیسری جماعت میں پڑھتا تھا۔ میں ان کا ٹیوٹر مقرر کر دیا گیا۔ پندرہ روپے ماہوار تنخواہ تھی اور روٹی کپڑا مفت۔ آسان کام تھا۔ چند دنوں میں ہی دل لگ گیا۔ ایک مہینے کے بعد امی کے پاس دس روپے بھیج دیئے۔ دل پر سے غم واندوہ کا غبار ڈھل گیا۔ زندگی پیاری اور دنیا حسین معلوم ہونے لگی!

میرا کمرہ بڑے پھاٹک کے متصل تھا۔ ایک رات میں ایک ناول پڑھ رہا تھا۔ کوئی بارہ بجے کا عمل ہو گا کہ پھاٹک پر دستک ہوئی! زنجیر کھولی تو دو عورتیں اندر داخل ہوئیں' ایک ادھیڑ عمر کی اور دوسری نوجوان۔ برقعے اور چہرے کھلے! ہاتھوں میں ننھے ننھے چرمی تھیلے! ادھیڑ عمر خاتون بولی۔ "تم کب سے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

آئے ہو یہاں۔"

میں نے کہا۔ "جی بس ڈیڑھ مہینہ ہوا ہے' یہاں بچوں کو پڑھاتا ہوں۔"

میں صبح سویرے اٹھا۔ ننھے میرے کمرے میں آئے تو میں نے پوچھا۔

"یہ نئے مہمان کون آئے ہیں تمہارے ہاں!"

جواب ملا۔ "ایک ہماری خالہ ہیں اور دوسری ہمارے خلیری بہن ثریا۔"

"کب تک ٹھہریں گی یہاں؟" میں نے پوچھا۔

"خدا جانے۔" جواب ملا۔

جب میں بچوں کو پڑھا چکا اور یونہی چہل قدمی کے لیے صاف کپڑے پہن کر باہر نکلا تو پھاٹک پر ثریا کھڑی تھی۔

مجھے دیکھ کر آنکھیں جھکالیں اور ایک طرف ہو گئی۔

اور راولپنڈی کی صاف ستھری اونچی نیچی سڑکوں پر چلتے ہوئے مجھے یوں محسوس ہوا جیسے فضا میں کسی نے عنبر اور لوبان اور قوس قزح گھول دی ہے اور جیسے لپٹیں اور رنگوں کے مرغولے اندر اڑے آرہے ہیں۔ یونہی بے وجہ مسکراتا اور گنگناتا رہا اور جب مسکراتے اور گنگناتے تھک گیا تو ایک تانگہ کرایہ پر لیا۔ اور شہر کے حسین ترین حصوں کے چکر لگائے۔ جب لوٹا تو ایک بج چکا تھا۔ گھر کی ملازمہ زینت پھاٹک پر کھڑی میری راہ تک رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی پکاری۔ "آپ نے تو بہت دیر لگا دی منشی جی!"

اور جب میں اپنے کمرے میں داخل ہوا تو بولی۔ "لے آؤں کھانا؟"

"لے آ" میں نے کوٹ اتارتے ہوئے کہا۔

کھانا لے آئی تو بولی۔ "پانی لے آؤں۔"

پانی لے آئی تو بولی۔ "جاؤں؟"

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"جا۔" میں نے لقمہ چباتے ہوئے کہا۔

اور جب وہ جانے لگی تو میں نے محسوس کیا کہ اس نے دروازے پر جا کر مجھے پلٹ کر دیکھا ہے۔

اس کا یہی معمول تھا۔ لیکن آج اس کی حرکت میں مجھے کئی اسرار پنہاں نظر آ رہے تھے۔ آج تو جیسے میرے چھوٹے سے دماغ کو کسی نے تیز دھونکنی سے دہکا دیا تھا۔ مجھے دیوار کے کلنڈر کی تصویر میں بھی نئے رنگ جھلکتے نظر آئے اور باورچی خانہ میں کام کرتی ہوئی زینت کے کڑوں کی آواز میں کئی دلربا نغمے سنائی دینے لگے۔ میں رنگوں اور نغموں کے ہجوم میں گھرا بیٹھا تھا کہ آواز آئی۔ "اور پانی لاؤں؟"

"لا دے۔" میں نے کہا اور جب میں نے گلاس اٹھا کر زینت کے ہاتھ میں تھمانا چاہا تو میرا انگوٹھا اس کی انگلیوں سے مس ہو گیا۔ اور وہ گلاس کو دوسرے ہاتھ میں پکڑ کر ہاتھ جھٹکاتے ہوئے بولی۔ "ہے ہے منشی جی! آپ کا ہاتھ کتنا گرم ہے۔"

اور جب وہ پانی لے کر آئی تو ساتھ ہی کونین کی دو گولیاں بھی تھیں۔ "کونین بھی لے لیجئے۔ کہیں بخار نہ ہو جائے آپ کو۔ آج آپ کا چہرہ بھی لال ہے۔"

"بہت اچھا۔" میں نے کہا۔ "شکریہ۔"

اس نے مسکرا کر برتن اٹھائے اور جب دروازے تک پہنچی تو مجھے پلٹ کر دیکھا اس کے لبوں پر بہت پیاری مسکراہٹ کھیلنے لگی۔ اور میں میز کا روغن کھرچنے لگا۔

دروازے سے نکلی تو ٹھٹک کر کھڑی ہو گئی۔ اور پھر ایک طرف سے پلٹ کر چل دی۔ ادھر ثریا میرے دروازے کے قریب سے گزرتی پھاٹک تک گئی اور پھر دروازے تک آ کر بولی۔ "کیا وقت ہے منشی جی؟"

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"جی میرے پاس گھڑی نہیں۔" میں نے کانپتی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

وہ دیر تک پھاٹک پر کھڑی رہی اور جب اندر جانے کے لیے میرے دروازے کے سامنے سے گزری تو میری طرف دیکھا اور اپنے پاؤں کی ہر چاپ پر میرا دل دھڑکاتی گئی۔ دیوار پر کلنڈر والی تصویر جیسے تُلی ہوئی ہتھیلیوں کو گھما گھما کر ناچنے لگی۔ میں نے جاسوسی ناول کو اٹھا کر الماری میں پٹخ دیا اور دیر تک بے معنی باتیں سوچتا رہا اور جب بہت سوچ چکا تو میرا دماغ بے سروپا خیالات کے ہجوم سے پٹا پڑا تھا۔ میں نے سونے کی کوشش کی مگر تکیہ دھڑکنے لگا۔ آرام کرسی پر جا کر بیٹھا تو جیسے زمین نیچے سے ہٹ گئی ہے۔ دیر تک کمرے کے چکر کاٹتا رہا۔ اور جب تھک گیا تو بچے پڑھنے آگئے۔

رات ہوتے ہی میرے دل کے نہاں خانوں میں سے خیالات کے پتنگے ابل پڑے اور دو روشن چہروں کے ارد گرد منڈلانے لگی۔ میں نے اپنے احساسات کے کارواں کو دوراہے پر کھڑا محسوس کیا۔ ادھر ثریا تھی اور ادھر زینت۔ ادھر مکمل بیگانگی تھی اور ادھر دھندلکوں میں لپٹی ہوئی دلچسپی! لیکن ادھر حسن کے اردگرد زریں ہالا تھا اور ادھر گردو غبار۔ قدم ڈگمائے۔ لڑکھڑائے اور میرے جذبات کے پتنگے میرے ارادے کے تیز جھونکوں میں اڑے اور ثریا کے چہرے کے زریں ہالے کا طواف کرنے لگے۔ زینت کے تصور کی دھندلی شمع ٹمٹما کر بجھ گئی۔ میں خواب اور بیداری کے درمیان دھندلے خلا میں رات بھر پرواز کرتا رہا۔ اور جب صبح آنکھ کھلی تو سامنے زینت کھڑی تھی۔

"چائے لے آؤں؟" اس نے مسکرا کر پوچھا۔

"لے آ۔" میں نے کہا۔

اور دروازے تک جا کر پلٹی اور کہنے لگی۔ "بخار اتر گیا ہے؟"

——— پھر میرے قریب آکر بولی۔ "دیکھوں تو۔"

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اور اس نے میری کلائی تھام کر نبض کی تلاش شروع کی۔

"آج تو شاید تمہیں بھی بخار ہے۔" میں نے کہا۔ "تمہاری انگلیاں تپ رہی ہیں۔"

اور وہ میری کلائی کو دبا کر بولی۔ "جی ہونا چاہئے تھا مجھے۔ میں رات بھر جاگتی رہی اور دعا کرتی رہی۔"

میں نے اوپر دیکھا تو اس کی پلکیں بھیگ رہی تھیں اور گال تمتما رہے تھے!

جب میں چائے پی چکا تو کچھ دیر کے بعد بچے پڑھنے آ گئے۔

میں بچوں کو اردو پڑھا رہا تھا کہ ادھر سے ثریا گزری۔ بچوں کو دیکھ کر اندر چلی آئی اور دری پر بیٹھ کر بولی۔ "بچے کیسے ہیں منشی جی۔"

"اچھے ہیں۔" میں نے ثریا کی مرمریں گردن پر بکھرے ہوئے نیم زریں نیم سیاہ بال دیکھتے ہوئے کہا۔ "خالد کو اپنی کتاب کی بیشتر نظمیں یاد ہیں۔ اور ریاض جمع تفریق کے سب سوال نہایت آسانی سے حل کر لیتا ہے۔"

اور وہ خالد کی پیٹھ ٹھونک کر بولی۔ "شاباش خالد۔ تم شاعر بنو گے اور ریاض صاحب کلرک بنیں گے ضلع کچہری میں۔ ریاض تم کیا بنو گے؟"

ننھا ریاض آنکھیں جھپکا کر بولا۔ "ڈپٹی کمشنر۔"

"اور تم خالد؟"

"شاعر۔"

"کوئی شعر یاد ہے؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں۔" وہ بولا

"سناؤ تو ایک" ثریا مسکرائی۔

اور خالد بولا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہیں لوگ وہی جہاں میں اچھے

آتے ہیں جو کام دوسروں کے

"شاباش" ثریا بولی۔ "بڑے پتے کا شعر یاد کر رکھا ہے۔"

اور ثریا میری طرف دیکھ کر کہنے لگی۔ "ہم نے ارادہ کیا ہے کہ اپنا ننھا بھائی یہاں بھیج دیں۔ خالو میاں آپ کی بہت تعریف کرتے ہیں۔"

جب وہ چلی گئی اور بچے بھی کچھ دیر کھیلنے کے لیے باہر نکل گئے تو میں پلنگ پر بیٹھ کر اپنی کتابیں الماری میں سجانے لگا۔ کچھ دیر کے بعد ثریا آئی اور بولی "کوئی اچھی سی ادبی کتاب ہو گی آپ کے پاس؟"

میں نے پرانے رسائل کی ایک فائل کو جھاڑ کر کہا۔ "یہ ادبی رسالے ہیں۔"

"آپ کو ان میں سے کونسا افسانہ یا نظم پسند ہے؟" اس نے جھک کر پوچھا۔

اور میں نے ایک افسانہ نکال کر کہا۔ "یہ"—— اوپر دیکھا تو وہ افسانے کی بجائے مجھے دیکھ رہی تھیں۔

آنکھیں جھپک گئیں ہم دونوں کی۔ اس نے کانپتی ہوئی آواز میں پوچھا...... "کونسی بات اچھی ہے اس میں؟"

"مرد عورت کی غیر فانی وفا۔" میں نے ہچکچاتے ہوئے کہا اور اس نے مسکرا کر فائل اٹھائی اور کمرے سے باہر نکل گئی۔

اور میں دن بھر مسرور رہا کہ میں ایک ایسی بات کہنے میں کامیاب ہو گیا تھا جو بڑے بڑے حوصلہ مند نوجوانوں سے برسوں کی کوشش کے بعد بھی ادا نہیں ہو سکتی!

شام کو جب بچے پڑھ چکے تو وہ پھر میرے پاس آئی۔ اور بولی۔ "بہت اچھی کہانی تھی۔ میں نے اسے دوبار پڑھا ہے، لیکن۔" اور وہ پلٹ کر دروازے کی طرف دیکھنے لگی۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

لیکن کیا؟" میں نے پوچھا۔

اور وہ میرے قریب آکر بولی۔ "لیکن افسانہ نگار نے مرد کو بہت زیادہ وفا شعار ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ دراصل مرد کی محبت عورت کی محبت کے پاسنگ بھی نہیں ہوتی!"—— اور یہی وقت تھا جب تذبذب کے قلعے کا آہنی دروازہ پھٹ سے کھل کر زمین پر بچھ گیا اور اس کے بعد راتوں کی سنسناتی ہوئی تنہائیوں میں میں نے اس کمرے میں ثریا کی زلفوں کے خم گنے۔ اس کے ماتھے کے نور اور اس کے ہونٹوں کے رس اور اس کی باہوں کے گداز کی باتیں کیں۔ کائنات میرے لیے بہت وسیع ہو گئی اور میرے دل و دماغ میں بھوک اور غم کی سڑاند یکسر ناپید ہو گئی۔ تنخواہ پندرہ کے بجائے بیس ہو گئی جو نت نئے لباسوں پر خرچ ہو جاتی تھی۔ بالوں میں کنگھی کرتے ہوئے میں آدھ آدھ گھنٹہ صرف کر دیتا۔ گلے میں ٹائی باندھنے کے جدید طریقے میں نے ہر شناسا سے دریافت کیے! میں نے ایک گھڑی بھی خرید لی!

ثریا بلا کی ذہین اور طباع تھی۔ جب وہ باتیں کرتی تو اچھے اچھے مصنفوں کی کتابیں گرد معلوم ہونے لگتیں۔ جب وہ مسکراتی تو روشندانوں کے شیشوں میں سے جھانکتے ہوئے ستارے ماند پڑ جاتے۔ جب وہ میرے قریب ہوتی تو ساری کائنات دم سادھ لیتی!

لیکن جب صبح ہوتی اور زینت مسکراتی ہوئے میرے سامنے چائے کا طشت رکھ کر کہتی "آپ خاموش کیوں ہیں؟" تو چار طرف غیر مرئی اجسام ناچ ناچ کر تالیاں بجانے لگتے اور میرے روئیں روئیں میں دل دھڑکنے لگتا۔ ایک روز جب میں چائے پی رہا تھا اور وہ خاموش میرے پاس کھڑی تھی تو میں نے یونہی اوپر دیکھا۔ وہ مسکرا رہی تھی!

میں نے ناک بھوں چڑھا کر کہا۔ "تم یہاں آکر ہر وقت مسکراتی رہتی ہو، یہ ٹھیک نہیں۔ میں ایسا کم ظرف نہیں کہ گھر کی ملازمہ سے عشق کی پینگیں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بڑھاؤں۔ مجھے اور بہت سی مصروفیتیں ہیں۔ سنا؟"

اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں اور اپنے گلے کو ایک ہاتھ سے دبا کر بولی۔

"آپ کیسی باتیں کرتے ہیں ——— !"

اور وہ کمبخت رو دی!

میں نے کہا۔ "تم میرے کمرے میں نہ آیا کرو۔ سمجھیں؟ کوئی اور ٹھکانہ ڈھونڈو۔ مجھ پر ان آنسوؤں کا اثر نہیں ہو سکتا۔ میں ایسا آوارہ نہیں۔"

وہ چلی گئی۔ شام کو میں اپنے پلنگ پر چادر کی شکنیں درست کر رہا تھا تو اس نے ہولے سے دروازہ کھولا اور کچھ بولنے کے لیے لب ہلائے کہ میں نے کہا۔ "نکل جاؤ میرے کمرے سے۔ نکل جاؤ! ورنہ میں بی بی جی کو بتا دوں گا۔"

"منشی جی۔" اس نے ہراساں لہجے میں کہا۔ "منشی جی! میں آپ کے لیے ——— میں نے ———"

اور میں بات کاٹ کر بولا۔ "منشی جی کی بچی! دور ہو میرے سامنے سے 'گھر کی نوکرانی سے مجھے عشق لڑانا نہیں آتا۔ میں ایسا ذلیل نہیں۔"

اور دروازے سے نکلتے ہوئے اس نے مجھے یوں دیکھا جیسے میرا گلا کاٹنے کے لیے کسی تیز چھرے کی تلاش میں جا رہی ہے۔!

رات کے دس بجے تھے کہ حسب معمول ثریا چپکے سے میرے کمرے میں آئی۔ چٹخنی چڑھا کر پردے کھینچ دیئے اور میرے پلنگ پر گر پڑی۔!

ہر روز کی دہرائی ہوئی باتیں ہوتی رہیں اور جب وہ تھک گئی تو میں نے کہا۔ "ثریا میں نہیں جانتا کہ ہمارا مستقبل کیا ہو گا۔ لیکن یاد رکھو کہ میری زندگی کا ہر ہر لمحہ تمہارے نام معنون ہو چکا ہے۔ قانون اور رواج کے بھوت ہمارے دلوں پر کبھی اثر انداز نہیں ہو سکتے۔ اس مقدس حریم میں ان ناپاک روحوں کا گزر نہیں۔ میں تمہارے قدموں پر ———"

چھنا چھن! میرے کمرے کے دروازے کا شیشہ ٹوٹ کر فرش پر بکھر

www.iqbalkalmati.blogspot.com

گیا۔ ایک ہاتھ نے پردہ چن کر ایک طرف کر دیا۔ زینت کی پھٹی پھٹی آنکھیں ہم دونوں کو گھورنے لگیں اور پھر آواز آئی۔ "ہوں۔ یہ بات ہے!"

اور وہ لوٹ کر بھاگی اور پکاری۔ "بی بی جی——ہے بی بی جی!"

ثریا گھبرا کر کھڑی ہو گئی تھی۔ میرا دماغ ایک وحشت ناک دھماکے سے جیسے پھٹ گیا۔ میں بھڑک کر اٹھا۔ ثریا سے ٹکرایا اور وہ لڑکھڑا کر میرے بکس پر جا گری اور جب اٹھی تو کونے میں مکڑی کے جالے اس کے بالوں سے لپٹ گئے۔

چٹخنی کھول کر میں باہر بھاگا۔ پھاٹک کا دروازہ کھول رہا تھا کہ زنان خانے سے زینت کی آواز آئی۔ "دونوں بی بی جی! دونوں اکٹھے ایک پلنگ پر— منشی جی اور ثریا بی۔"

میں پھاٹک کھول کر باہر لپکا اور آن کی آن میں راولپنڈی کی سڑکوں پر اڑتا اسٹیشن پر پہنچ گیا۔

اور جب گاڑی چلنے لگی تو اچانک مجھے امی یاد آگئیں۔ اور امی کی یاد نے میری گزشتہ زندگی کے سارے ورق تیزی سے الٹنے شروع کر دیئے!

اور جب میں گھر پہنچا تو نو بجے رات کا وقت تھا۔ امی انگیٹھی میں بجھتے ہوئے اپلے ڈالے ہاتھ تاپ رہی تھیں۔ مجھے دیکھ کر میری طرف بڑھیں۔ میری گردن کو چوما اور فرطِ محبت سے بولیں۔ "تو کتنی رقم لے آیا میرے لال؟"

اور میں پھوٹ پھوٹ کر روتا فرش پر لیٹ گیا اور میری جیب میں سے ساڑھے تین آنے نکل کر انگیٹھی کے نیچے لڑھک گئے!

✿

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ماں

گو انہوں نے شادی سے پہلے ایک دوسرے کو نہیں دیکھا تھا، تاہم پہلی ہی ملاقات میں انہیں معلوم ہو گیا کہ ان کے مذاق اور مزاج یکساں ہیں۔ ان کے دلوں کی دھڑکنیں ہر حال میں ہم آہنگ ہیں۔ خارجی طور پر ان کے وجود الگ الگ سہی لیکن ان کا خمیر ایک ہی مادہ سے اٹھایا گیا ہے!

شادی کے بعد ولی محمد نے اپنی زمین بیچ کر ایک خچر خرید لیا۔ اس کی زمین کے تمام قطعے ڈھلانوں پر تھے جہاں پانی ایک لمحہ بھی نہیں رک سکتا۔ اور پھر دو سال سے علاقہ پر خشک سالی کا دیو منڈلا رہا تھا۔ خچر خرید لیا اور چوپال پر جا کر اعلان کر دیا کہ اگر کسی شخص کو سٹیشن جانا ہو تو وہ اس سے صرف ——— بارہ آنے لے گا۔ سامان بھی لادے اور خود بھی سوار ہولے۔

ایک شخص جسے شاید اونٹوں کی تکلیف دہ سواری کا خاص طور پر تجربہ حاصل تھا۔ بولا "ولی محمد یہ بہت اچھا کیا ——— تم نے ——— کہاں اونٹوں کے تنگ کجاوے، قدم قدم پر ہچکولے، ان کے بیٹھنے اٹھنے کے بھونڈے طریقے، اور پھر کرایہ دو روپیہ، اور کہاں خچر کی پیٹھ، سو جاؤ تو اسٹیشن تک آنکھ

www.iqbalkalmati.blogspot.com

نہ کھلے اور پھر کرایہ بارہ آنے!"

ولی محمد کو اپنا مستقبل بہت شاندار دکھائی دینے لگا!

ایک سال میں اس نے چالیس پچاس روپے جمع کر لیے۔ ننھا پیدا ہوا تو پانچ روپے کا گڑ تقسیم کیا۔ ننھے کی ماں کے لیے جاپانی ریشم کی ایک سرخ رنگ کی قمیض تیار کرائی۔ جس پر جگہ جگہ نیلے نیلے گل بوٹے تھے۔ گلابو قمیض پہن کر بولی۔ "ہائیں کیا میں نے قمیض پہن رکھی ہے! مجھے تو یوں معلوم ہوتا ہے جیسے میں ابھی ننگی کھڑی ہوں۔"

ولی محمد فخریہ انداز میں اکڑ کر بولا۔ "ملائم کپڑا ہے نا! اور پھر عورتوں کے لیے تو ایسے ہی کپڑے چاہئیں۔ تمہیں وہ کھدر کا چولا پہنے دیکھ کر میرا کلیجہ جل جاتا تھا۔ اب مزے اڑاؤ!"

لیکن گلابو نے عمر بھر میں ریشم کی صرف وہی قمیض پہنی!

ایک روز چوپال پر ولی محمد نے سنا کہ اسٹیشن سے لے کر ان کے گاؤں تک پکی سڑک بننے والی ہے۔ اب اس پر تانگے چلیں گے۔ اونٹ خچر کا زمانہ گیا۔

ولی محمد نے چاہا کہ الاؤ سے ایک دہکتا ہوا کوئلہ اٹھا کر نگل جائے۔

وہی شخص جس نے ولی محمد کے خچر خریدنے پر پرزور الفاظ میں اظہار مسرت کیا تھا۔ بولا۔ "اونٹ کے ہچکولوں سے نجات ملی تھی مگر بخدا خچر پر سوار ہوتے وقت شرم آتی تھی۔ آخر گدھے اور خچر میں فرق ہی کیا ہے! وہی چال ڈھال' وہی تراش خراش۔ میرا تو خیال ہے کہ اگر تمہیں کسی سے دشمنی ہو تو اسے خچر پر سوار کرا دو!"

اس دن ولی محمد گھر آیا تو خچر کو چارہ ڈالنا بھول گیا۔ خچر کچھ دیر تک خاموش کھڑا ولی محمد کو گھورتا رہا جو کھاٹ پر کروٹیں بدل رہا تھا۔ پھر اپنی دم اٹھا کر اور تھوتھنی نکال کر ایسی کرخت آواز بلند کی کہ ولی محمد نے اٹھ کر پھاوڑے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

سے اس کی کمر توڑ ڈالی۔ گلابو جاگ رہی تھی' بولی۔ "ہائے ہائے۔ ایک سال تک تم اس کی آواز ہنس ہنس کر سنتے رہے۔ آج اس سے کیا قصور ہوا کہ بیچارے کی پیٹھ پر پھاوڑے برسا رہے ہو؟ اپنے رزق کو یوں پالتے ہیں کیا؟"

ولی محمد بولا۔ "اری چپ رہ تجھے نہیں معلوم۔ اب یہ کمبخت ہمارے کسی کام کا نہیں۔ سٹیشن سے یہاں تک سڑک بننے والی ہے۔ اب یہاں لاریاں' تانگے چلیں گے۔ اب خچروچر کو کوئی نہیں پوچھے گا۔ ہمارے برے دن آ گئے!"

وہ اپنی بیوی کی چارپائی پر بیٹھ گیا اور دھیمی آواز میں بولا "گلابو بتا اب کیسے گزر ہو گی۔ زمینیں بک گئیں۔ ورنہ پھر ہل اٹھا لیتے۔ میں تو سمجھا تھا اب مرتے دم تک ہاتھ کبھی تنگ نہ ہو گا۔"

گلابو خاموش رہی۔ ننھا بچہ اس کی چھاتی سے چمٹا ہوا تھا اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

ولی محمد پھر بولا۔ "گلابو شکر ہے تم میرے پاس ہو' ورنہ میں آج روتے روتے دیوانہ ہو جاتا۔"

گلابو نے اپنا ہاتھ ولی محمد کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ دونوں خاموش بیٹھے آنسو بہاتے رہے۔ ننھا غوں غوں کرتا آسمان کی طرف دیکھتا رہا۔

سڑک تیار ہو گئی۔ تانگے والوں کی بن آئی۔ ولی محمد کے خچر کا تھان پر کھڑے ہو کر اپنی میلی دم سے مکھیاں اڑانے کے سوا اور کام کوئی نہ تھا۔ ولی محمد کی کمائی آہستہ آہستہ برف کے تودے کی طرح پگھلنے لگی۔

اس کی رفیقۂ حیات اگر گلابو کے علاوہ کوئی اور ہوتی تو وہ اب تک ضرور مر چکا ہوتا۔ لیکن باجرے کی موٹی اور بھاری روٹی توے پر ڈالتے ہوئے گلابو اپلوں کے دھوئیں سے سوجی ہوئی آنکھیں اٹھا کر ولی محمد کی طرف دیکھتی تو ولی محمد کو اپنی پیوند لگی قمیض اور سوکھے بے رونق گالوں کا خیال تک نہ رہتا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

گلابو کی جاپانی ریشم کی قمیض بھی کئی مقامات سے گل گئی تھی اور کئی جگہ سے اس کا جسم بھی جھلکنے لگا تھا جسے وہ اپنے بازو سے ہروقت چھپانے کی کوشش کرتی رہتی تھی۔ لیکن اس کی زبان پر شکایت کا ایک لفظ تک نہ آیا۔ بس وہ ایک نظر ولی محمد کو دیکھ لیتی تو اسے یوں محسوس ہونے لگتا جیسے وہ اطلس اور کمخواب سے اپنی جوتیاں پونچھ رہی ہے۔

ایک دن ولی محمد صحن کے ایک کونے میں بیٹھا حقہ گڑگڑا رہا تھا۔ اچانک اسے کوئی خیال آیا۔ حقے کی نال ہونٹوں سے الگ ہو گئی۔ اٹھ کر گلابو کے پاس آیا۔ کہنے لگا۔ ”گلابو تیری جوتی تو اب بہت پرانی ہو گئی ہے۔“

گلابو مسکرا دی۔

وہ بولا۔ ”گلیوں میں چلتے وقت تجھے پتھر چُبھتے ہونگے تو ضرور دل میں کہتی ہو گی کہ کسی کنگلے سے پالا پڑا جو پاؤں میں پہننے کے لیے جوتی تک نہیں خرید سکتا ہے۔“

گلابو کو جیسے کسی ناگ نے ڈس لیا ہو۔ بولی۔ ”میں شریف ماں باپ کی بیٹی ہوں۔ اور مجھے اپنے آرام سے زیادہ اپنے ماں باپ کی عزت کا پاس ہے۔ میں تمہاری لونڈی ہوں۔ کیا میں دیکھ نہیں رہی کہ تمہارے جوتے کو بھی جگہ جگہ پیوند لگے ہیں۔ مجبوری ہے تو پھر گلہ کیسا؟ خدا جس حال میں رکھے' اس کا شکر ہے۔ اس سے بدتر نہ کرے۔“

ولی محمد دیوار کا سہارا لے کر بولا۔ ”مگر گلابو اب بتاؤ میں کیا کروں' خچر بیچ ڈالوں مگر کون خریدے گا اسے؟ ہڈیوں کا ڈھانچہ باقی رہ گیا ہے۔ دس بارہ روپے ہی ملیں گے۔ چالیس روپے کے خچر کے دس بارہ روپے!“

کچھ دیر دونوں خاموش رہے۔ ننھا گلابو کی گود میں غوں غوں کر رہا تھا۔ خچر اپنے تھان پر آنکھیں کھولے لیٹا ہوا تھا۔ اس کے تھوتھنی اور آنکھوں پر مکھیوں کی فوجیں بھنبھنا رہی تھیں۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ناگاہ ولی محمد بولا۔ "گلابو! ایک بات سوجھی ہے مجھے۔ اگر تم پسند کرو تو آج ہی سے کام شروع کر دوں۔ سٹیشن پر ہر وقت مزدوروں کی ضرورت رہتی ہے۔ ہمارا پڑوسی تاج محمد بھی تو سٹیشن پر کام کرتا ہے۔ پچھلے دنوں میں نے اس کی بیوی کے پاؤں میں نئے سلیپر دیکھے تھے۔ آخر کچھ تو بچاتا ہو گا۔ تم سے الگ رہنا میرے لیے قیامت ہے لیکن پیٹ کے لیے کیا کچھ نہیں کرنا پڑتا۔ کہو تو کل سٹیشن چلا جاؤں۔!"

گلابو نے رضامندی ظاہر کی' لیکن بہت دھیمی اور قدرے بھرائی ہوئی آواز میں "شاید اس طرح گزری گھڑیاں پھر لوٹ آئیں۔ تم سٹیشن پر چلے جانا' میں یہاں رہو نگی۔ جب کبھی وقت بے وقت کسی مسافر کو خچر کی ضرورت پڑ گئی' میں اسے سٹیشن تک پہنچا آؤں گی اور تم سے بھی مل لوں گی۔ اندھیرے اجالے اس پر کئی بار سفر کیا ہے' بھولوں گی نہیں۔"

ولی محمد نے اسی دن ایک چھوٹا سا بستر کاندھے پر رکھا اور آنسو بہاتا روتی ہوئی گلابو سے رخصت ہو کر سٹیشن کی طرف چل دیا۔

گلابو نے اس کے بعد دو وقت کھانا نہ کھایا۔ اس کا دودھ کم ہوا تو بچہ بلکنے لگا۔ مجبوراً دوسرے روز کچھ لقمے زہر مار کئے اور تمام دن کھاٹ پر پڑی رہی۔ایک دو بار پڑوس کی عورتوں میں جا بیٹھی لیکن جی نہ لگا۔ واپس آکر اسی کھاٹ پر پڑی رہی جس پر ولی محمد سویا کرتا تھا۔ ننھے سے تادیر باتیں کرتی رہی۔ "ننھے تیرا باپ سٹیشن پر کیا کر رہا ہو گا۔ جب وہ آئے گا تو تیرے لیے قسم قسم کے کھلونے قسم قسم کی مٹھائیاں لے کر آئے گا۔ ارے منہ کیوں بسور رہا ہے؟ کیا تجھے مٹھائیاں پسند نہیں؟ دودھ پیئے گا؟ لے"

اس طرح وہ ساری رات بچے سے باتیں کرتی رہتی اور جب وہ سو جاتا تو گھٹنوں میں سر چھپا کر دیر تک روتی رہتی!

ایک رات وہ بچے کو سلا کر دیا بجھانے کے لیے اٹھی کہ باہر کسی نے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اس کا دو روازہ کھٹکھٹایا اور آواز آئی۔ "کیا ولی محمد خچر والے کا مکان یہی ہے؟"

"جی یہی ہے؟"

"کیا اس وقت سٹیشن پر خچر لے جا سکو گے؟"

"جی وہ خود تو گھر میں نہیں۔"

"افوہ! مجھے تو سٹیشن پر آج رات کو ضرور پہنچنا تھا۔ اور اس وقت تانگہ نہیں ملتا۔"

گلابو نے جا کر دروازہ کھول دیا۔ ایک نوجوان بہت قیمتی کپڑوں میں ملبوس ہاتھ میں بجلی کی ٹارچ لیے کھڑا تھا۔ اس کے چہرے سے وحشت برس رہی تھی۔

گلابو بولی "آپ کیا دیں گے سٹیشن تک؟"

"مگر خچر کے ساتھ جائے گا کون؟"

"میں!"

"تم؟"

"جی ہاں۔"

"مگر کیا تم راستہ جانتی ہو؟ اس قدر اندھیرا ہے اور......؟

"آپ کے پاس چور بتی جو ہے!"

"میں اٹھنی دوں گا۔"

"اٹھنی؟ سامان ہے؟"

"نہیں۔"

"تو چلیے۔"

گلابو نے جھٹ خچر پر زین رکھا۔ خچر کے کان کھڑے ہو گئے اور وہ مڑ مڑ کر گلابو کی طرف دیکھنے لگا۔ مدت سے اس کی پیٹھ زین سے آزاد رہی تھی۔ اس لیے ایک دو بار اس نے ضد بھی کی۔ دولتیاں بھی جھاڑیں۔ مگر جب دیکھا

کہ گلابوں زین کس کر ہی دم لے گی تو چپکا ہو رہا۔

گلابو نے ننھے کو سینے سے لگا لیا۔ دروازے کو مقفل کیا۔ نوجوان خچر پر سوار ہو گیا اور دونوں اندھیری گلیوں سے نکل کر باہر کھلے راستے پر آ گئے۔

اندھیری رات میں ایک اجنبی نوجوان کی ہمراہی میں صرف ایک اٹھنی کے لیے بارہ میل کا پہاڑی سفر کرنا گلابو کی فطرت کے خلاف تھا۔ لیکن وہ سوچتی جا رہی تھی کہ جب ولی محمد اسے صبح کو دیکھے گا تو خوشی سے یقیناً ناچنے لگے گا۔ ولی محمد کو گاؤں سے گئے صرف آٹھ دن گزرے تھے۔ مگر گلابو سمجھ رہی تھی جیسے آٹھ سال بلکہ آٹھ صدیاں گزر گئی ہیں!

دو میل بڑی سڑک پر چل کر وہ ایک پگڈنڈی پر ہو لیے۔ یہ راستہ خچروں اور پیدل چلنے والے لوگوں کے لیے تھا جو بڑی سڑک سے تین میل کم تھا۔ گنجان جھاڑیوں، ننھے جھرنوں اور تاریک دروں سے گزر کر وہ ایک گہری کھائی میں پہنچ گئے۔ جہاں سے آگے سٹیشن تک دو ڈھائی فٹ کی ایک پگڈنڈی تھی۔ اس کے دونوں طرف گہرے بھیانک کھڈ تھے اور کناروں پر گول گول پتھر تھے جو ذرا سے دباؤ سے نیچے لڑھک جاتے تھے۔ یہاں سے گلابو نے خچر کی لگام اپنے ہاتھ میں لے لی۔ اب نوجوان کی چور بتی بڑا کام دے رہی تھی۔

وہ کچھ دور گئے تھے کہ نوجوان بولا۔ "تمہارا نام کیا ہے؟"

گلابو کو پسینہ آ گیا۔ وہ خاموش رہی۔ ڈرنے لگی کہ کہیں بچہ اس کے دل کی دھک سے جاگ نہ اٹھے۔

"تمہارا نام پوچھا تھا میں نے؟"

"گلابو" گلابو نے یہ لفظ بہت مشکل سے ادا کیا۔ وہ خوفزدہ ہو گئی تھی۔

"گلابو تم نے بڑی مہربانی کی۔ ایسی اندھیری رات میں تم میرے ساتھ چلنے کو تیار ہو گئیں۔ تم نے بڑی مہربانی کی۔"

www.iqbalkalmati.blogspot.com

گلابو نے سوچا' کیا شکریہ ادا کرنے کا یہی موقع تھا؟ اور یہ نام پوچھنے سے کیا مطلب؟"

نوجوان پھر بولا۔ "لو اب تم خچر پر سوار ہو لو۔ میں پیدل چلوں گا ــــــــــ تمہارے لیے۔"

گلابو نے چاہا نیچے کھڈ میں چلانگ لگا دے۔ لیکن چھاتی سے چمٹے ہوئے بچے نے نیند میں کہا۔ "مم۔ مم۔" اس کے قدم لڑکھڑانے لگے۔

فضا بالکل خاموش تھی۔ صرف کبھی کبھی کوئی پتھر خچر کے سم سے ٹکرا کر نیچے کھڈ میں لڑھک جاتا تھا۔ نوجوان کی چور بتی گلابو کے سر پر پڑ رہی تھی اور گلابو کا لمبا سایہ سامنے تنگ پگڈنڈی پر بہت دور تک بچھا ہوا تھا۔ اس نے زندگی میں پہلی بار ایک غیر شخص کی زبانی یہ الفاظ سنے تھے۔ اس کی غیرت کو ٹھیس لگی۔

ہمت کر کے بولی۔ "ذرا سنبھل کر بیٹھیے۔ راستہ بڑا پر پیچ اور خطرناک ہے۔ جان کا ڈر ہے یہاں۔"

نوجوان زیرک تھا۔ سنبھل گیا۔ سٹیشن تک اس نے کوئی بات نہ کی۔

لیکن گلابو کو سٹیشن پہنچنے تک بخار سا ہو گیا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ وہ اپنے خاوند کو کیسے منہ دکھائے گی۔ کیا وہ اس کی گھبرائی ہوئی آنکھوں اور اڑے ہوئے رنگ سے رات کا واقعہ پڑھ نہیں لے گا۔

سٹیشن پر نوجوان سے اٹھنی لے کر وہ ایک طرف ایک شیشم کے درخت سے خچر باندھ کر بیٹھ گئی۔ پو پھٹ رہی تھی تو اس کے قریب سے ایک شخص گزرا۔ گلابو نے اٹھ کر پوچھا۔ "بھائی کیا تم سٹیشن پر رہتے ہو۔"

وہ رک گیا اور بولا "ہاں"

"یہاں ایک نیا مزدور آیا ہے ولی محمد' کیا تم اسے جانتے ہو؟"

"ہاں۔"

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"وہ اس وقت کہاں ہوگا؟"

"سامنے مسافر خانے کے تختے پر سو رہا ہے وہ!"

خچر وہیں چھوڑ کر وہ مسافر خانے میں گئی۔ مدھم روشنی میں اس نے ولی محمد کو پہچان لیا۔ اس نے اپنے گھٹنے سینے سے چمٹا رکھے تھے اور اس کے خشک بال اسکے بے رونق چہرے پر بکھرے ہوئے تھے۔ وہ پہلے تو جھجکی کہ کہیں آنکھ کھولتے ہی وہ اس کے چہرے سے رات کا دلخراش واقعہ نہ پڑھ لے۔ لیکن آخر زبان کو دانتوں تلے دبا کر لرزتے ڈرتے اس نے ولی محمد کا ہاتھ پکڑ کر نرمی سے ہلایا۔

"کون؟"

وہ آنکھیں ملے بغیر اٹھ بیٹھا۔ "اری کیسے آئیں۔ ننھا تو اچھا ہے نا؟"

"اچھا ہے' یہ سو رہا ہے۔ ایک مسافر لائی ہوں۔"

"تھک گئی ہو گی تم؟"

"نہیں آہستہ آہستہ چلتی آئی ——— کوئی کام بنا؟"

"ہفتے میں تین آنے کمائے۔ ان کی روٹی کھا لی۔ آج بھوکا سو رہا ہوں۔"

دروازے سے لوگ آجا رہے تھے ورنہ گلابو پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی۔ اس نے بڑی مشکل سے ضبط کیا۔

ولی محمد بولا۔ "لیکن امید ہے کچھ دنوں میں کام بن جائے گا۔ ایک بابو نے وعدہ تو کیا ہے۔"

گلابو نے اسے اٹھنی دینا چاہی لیکن ولی محمد نے انکار کر دیا اور بولا۔

"خچر کے لیے چارہ خرید لینا۔ تیل نمک کی بھی ضرورت ہو گی۔ میری فکر نہ کرو ———" لیکن گلابو نے اسے چونی لینے پر مجبور کر دیا۔ ننھے کو ولی محمد کی گود میں رکھ کر روتی رہی اور پھر خچر پر سوار ہو کر گاؤں لوٹ آئی۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اسے مہینے میں دوبارہ پھر سٹیشن جانا پڑا۔ ابھی ولی محمد کا مستقل کام نہیں بنا تھا۔ مستقل اسامی کا انتظار کھینچنا بجائے خود ایک بیماری ہے۔ اس پر مستزاد متواتر فاقے! ولی محمد کی صحت بہت کمزور ہو گئی تھی۔ اسے واپس لانے کی گلابو نے بہت کوشش کی لیکن وہ یہی عذر پیش کرتا رہا۔ ”کیا وہاں قارون کا خزانہ مل جائے گا؟ یہاں ایک وقت پیٹ بھر لیتا ہوں۔ وہاں بھوکوں مر جاؤں گا۔“

ایک دن اچانک ننھا بیمار پڑ گیا۔ اس کا گلا سوج گیا اور سانس رک رک کر آنے لگی۔ گلابو اسے گاؤں کے حکیم کے پاس لے گئی۔ اس نے کہا۔ ”اس بیماری کا علاج ایک انگریزی دوا ہے جو یہاں نہیں مل سکتی۔ اس پر دس آنے خرچ آتے ہیں۔ اگر وہ لاسکو تو ننھا اچھا ہو جائے گا۔“

گلابو کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ گھر میں ایک کوڑی تک نہ تھی۔ جی میں آئی سر دیوار پر پٹخ کر پھوڑ دے اور مر جائے۔ یوں بچے کو سسکتے ہوئے مرتے دیکھنا تو بہت بڑا عذاب ہے۔ اب اگر سٹیشن جاتی ہے کہ ننھے کے ابا سے کچھ پیسے مانگ کر دوا خرید لائے تو ننھا اکیلا رہتا ہے۔ اور اگر ساتھ لے جائے تو حکیم کے کہنے کے مطابق سرد ہوا کی وجہ سے بیماری بڑھ جانے کا ڈر ہے۔ ساتھ نہ لے جائے تو جانے پیچھے کیا ہو جائے۔ اس کے دماغ میں شعلے اٹھنے لگے۔ وہ دیوانوں کی طرح گلیوں میں بے مطلب بھاگنے لگی۔

آخر ننھے کو ایک پڑوسن کے حوالے کر کے خچر پر سوار ہوئی اور سٹیشن کی طرف چل دی۔ آسمان پر گہرے سیاہ رنگ کے بادل چھائے ہوئے تھے۔ ٹھنڈی ہوا نہایت تیزی سے چل رہی تھی۔ برق رفتار جھونکے تلوار کی طرح گلابو کا سینہ چیر رہے تھے۔ بوندیں پڑنے لگیں۔ بادل اس زور سے گرجا جیسے علاقے کے سارے پہاڑ آپس میں ٹکرا کر زمین میں غرق ہو گئے ہیں۔ اس کے بعد موسلادھار مینہ، بجلی، کڑک، آندھی ——— بے رحم جھونکے، خچر

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کے قدم اکھڑ اکھڑ جاتے تھے۔ گلابو کے کپڑے اس کے جسم سے چمٹ گئے۔ بارش اور ہوا کے تھپیڑوں سے وہ جھک جھک جاتی تھی۔ درختوں کی چوٹیاں زمین کو چھو رہی تھیں۔ پہاڑی نالے بپھرے ہوئے شیروں کی طرح دھاڑنے لگے۔ جب خچر کسی نالے میں پھنس جاتا تو گلابو مایوس ہو کر اپنے آپ کو تقدیر کے حوالے کر دیتی۔ پگڈنڈی کے نشانات مٹ گئے۔ گلابو اللہ کے آسرے پر ناک کی سیدھ میں چلی جا رہی تھی۔

سٹیشن پر پہنچ کر اسے معلوم ہوا کہ ولی محمد بعارضہ نمونیہ سخت بیمار ہے اور تاج محمد قلی کی کوٹھڑی میں پڑا ہے۔ اس کی نظروں میں کائنات قلابازیاں کھانے لگی۔ چار جانب سے ایک مغموم سی مسلسل گونج اٹھنے لگی۔ ہانپتی ہوئی تاج محمد کی کوٹھڑی میں پہنچی۔ ولی محمد اکیلا کھاٹ پر پڑا چھت پر نظریں گاڑے کراہ رہا تھا۔ گلابو کو دیکھ کر بولا۔ "تمہیں کس نے بتایا؟"

گلابو دہل گئی۔ نہ اس کی زبان ہلی' نہ اس کی آنکھوں سے آنسو پھوٹا۔ منہ کھولے ولی محمد کے خشک ہونٹوں کو دیکھتی رہی۔

"ہاں" ——— جیسے خود اپنے آپ سے سرگوشی کر رہی ہے!

"تو مجھے گاؤں لے چلو۔"

وہ خاموش رہی۔

"لے چلو گی؟"

"ہاں۔ مگر ننھا سخت بیمار ہے۔"

"کیا؟"

"ننھا سخت بیمار ہے۔ میں اس کی دوا کے لیے تم سے دس آنے مانگنے آئی تھی۔"

"میرے پاس تو ایک کوڑی تک نہیں۔"

گلابو کا جیسے کسی نے گلا دبا دیا ہو۔ اس کی آنکھیں شدتِ غم سے جیسے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

باہر ابل پڑیں گی۔

یکایک باہر سے آواز آئی۔ "ارے یہ خچر کس کا ہے؟"

گلابو دوڑ کر باہر گئی۔ "میرا۔"

مسافر کو گلابو کے گاؤں جانا تھا۔ بارش کی وجہ سے سب تانگے مسافروں سے بھر کر جا چکے تھے۔

گلابو نے پوچھا۔ "کیا ملے گا؟"

"آٹھ آنے۔"

"دس آنے دیں گے آپ؟ میرا ننھا بیمار ہے۔ اس کے لیے دس آنے کی دوا خریدنی ہے۔"

مسافر کوئی نیک دل انسان تھا۔ دس آنے نکال دیئے۔ حکیم نے اسے دوائی کا آسان نام بتا دیا تھا۔ بازار دوڑی گئی۔ بوتل خرید لی۔ بھاگی بھاگی واپس آئی۔ مسافر کو خچر پر سوار کیا اور لگام پکڑ کر آگے آگے چل دی۔ وہ اس قدر تیز چل رہی تھی جیسے اس کے پاؤں میں بجلیاں بھر گئی ہیں۔ اس کا رنگ ہلدی کی طرح زرد ہو رہا تھا۔

تاج محمد نے مسافر اور گلابو کو دور جاتے ہوئے دیکھا تو ولی محمد کے پاس دوڑا آیا۔ "ولی محمد، ولی محمد گلابو ملی ہے تمہیں؟"

"ہاں۔"

"مگر وہ تو ایک مسافر کو خچر پر سوار کیے اڑی جا رہی ہے۔"

"اچھا!"

ولی محمد نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور تاج محمد سے پانی مانگا۔

تاج محمد نے پانی ڈالتے ہوئے کہا۔ "مگر گلابو نے یہ کیا کیا؟"

ولی محمد نے کروٹ بدلتے ہوئے کہا۔ "تم نہیں سمجھتے تاج محمد، تم نہیں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

سمجھتے' کیوں کہ تمہاری بیوی کے کوئی بچہ نہیں ہے؟"

* * *

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کریا کرم

لالہ گنیش داس کمیٹی کے ایک پرائمری سکول میں مدرس تھے۔ کنبہ اتنا بڑا نہ تھا کہ پریشان رہتے۔ ایک بیوی تھی اور ایک بیٹی۔ بیٹے کی آرزو میں ترستے رہے، جوگیوں کے پاؤں چومے، ویدوں کے قدموں پر تین تین مہینوں کی تنخواہیں نچھاور کر دیں اور نتیجہ یہ نکلا کہ ہمیشہ کے لیے مایوس ہو گئے۔ اپنی بیٹی مایا سے قدرتی طور پر وہ بے انتہا پریم کرتے تھے اور اسے اتنے لاڈ پیار سے پالا تھا کہ محلے کے آس پاس کھاتے پیتے سیٹھوں کی لڑکیاں بھی اس کی آن بان دیکھ کر جھینپ جاتی تھیں۔ قضائے الٰہی سے شہر میں گردن توڑ بخار کی وبا پھیل گئی۔ لالہ گنیش داس ایک دن بیمار رہے اور دوسرے دن سورگ سدھار گئے۔ مایا اور اس کی ماتا رام دتی نے سر پیٹ لیے۔ اس بلائے ناگہانی کا پہلے سے علم ہوتا تو تنخواہ میں سے کچھ نہ کچھ پس انداز کرتے رہتے۔ لیکن موت بجلی کی طرح آئی اور بسا گھر اجاڑ کر چل دی۔ اب یہ دونوں بد نصیب روحیں بے دست و پا ہو کر رہ گئیں۔ کرایہ کا مکان تھا تیسرے ہی دن وہاں سے کوچ کر کے ایک اور محلے میں آ گئیں۔ ایک اندھیری گلی میں ایک اندھیری کوٹھری تھی۔ آٹھ آنے ماہانہ

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کرایہ تھا۔ وہیں رہنے لگیں۔ دو چار روز بے حد پریشان رہیں۔ آگ جلاتی تھیں تو سارا دُھواں کوٹھری میں گھومتا رہتا تھا اور گھنٹوں وہ ہوا کے بجائے دھواں پھیپھڑوں میں بھرتی رہتی تھیں۔ اندھیرے کی وجہ سے ہوا میں نمی سی پائی جاتی تھی جس کی وجہ سے دھواں وہیں جم کر رہ جاتا تھا۔ جب بیچاری رام رتی پھونکیں مارتے مارتے ادھ موئی ہو جاتی تو مایا اسے بازو سے پکڑ کر پیچھے کھینچتے ہوئے کہتی۔ "ماتا جی' میں آپ سے کئی بار کہہ چکی ہوں اس کام سے میں نپٹ لوں گی۔ لیکن آپ سنی ان سنی کر دیتی ہیں۔ ادھر چٹائی پر ہو جایئے۔ میں آگ جلاتی ہوں۔"

رام دتی رو کر کہتی۔ "پُتری جب تیری آنکھیں ان گیلے اپلوں کے دھوئیں سے سوج کر سرخ ہو جائیں گی اور جب تیرے آنسو ڈھلک ڈھلک کر راکھ میں گریں گے تو تیرے پتا جی کی آتما سورگ میں بے چین ہو جائے گی اور میں برداشت نہیں کر سکتی!" دس بارہ پھونکیں مار کر وہ پھر کہتی۔ "پُتری جب تک میں زندہ ہوں تجھے چولھے کے قریب نہ جانے دوں گی۔ آخر میں بڑھیا اور کس کام کی ہوں! بھگوان کرے تیرے بھلے دن دور نہ ہوں۔"

مایا سوچا کرتی کہ اب بھلے دنوں کی دعا کا کیا مطلب ہے۔ اندھیرے میں کھدر کی چادروں پر بیل بوٹے کاڑھ کر ماتا جی جو آنے دو آنے کماتی ہیں' ان سے پیٹ بھر لیا جاتا ہے۔ کوٹھری کا کرایہ مشکل سے ادا ہوتا ہے۔ ابھی پتا جی کے کریا کرم پر جو رقم خرچ ہوئی تھی وہ بھی ان کے دوست رام بھروسہ کو ادا کرنی ہے۔ پھر یہ بھلے دنوں کی آرزو کیسی!

چند ہی دنوں میں وہ سامنے گلی سے گزرنے والوں کی صورت سے شناسا ہو گئیں۔ گلی آگے جا کر بند ہو جاتی تھی اور ان کی کوٹھری کے اختتام تک پانچ چھ مکان تھے۔ صبح شام چار بابو لوگ ان کے سامنے سے گزرتے تھے۔ ان کی عمریں ڈھل چکی تھیں اور وہ اکثر اپنی پگڑیوں کے نیچے اپنے سفید بال چھپانے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کی کوشش کرتے تھے جیسے مسجدوں کے ٹوٹے ہوئے گنبدوں اور کلیساؤں کے پرانے کلسوں پر امام اور پادری سبز بیلیں چڑھا دیتے ہیں۔

ان کے بچے کبھی کبھی کھیلتے کوٹھری کے قریب آجاتے اور مایا ایسی من موہنی صورت والی لڑکی کو دیکھ کر دم بخود رہ جاتے۔ مایا ان سے پیار کرتی۔ انہیں ان پریوں کی کہانیاں سناتی جو بہت اونچی اڑیں اور اس جرم کی پاداش میں اندھیرے گہرے اور بھیانک غاروں میں بند کر دی گئیں۔ ننھے بچے پوچھتے۔ "تو کیا اونچائی ایشور کو پسند نہیں؟" مایا جواب دیتی۔ "ایشور ان لوگوں کو بہت پسند کرتے ہیں جو دھرتی پر چلیں پھریں اور دھرتی پر بیٹھیں اٹھیں۔تم چوتھی پانچویں منزل پر رہتے ہو۔ خبردار رہا کرو نہیں تو تمہارا انجام بھی ان پریوں کا سا ہو گا۔" بچے یہ سن کر زور زور سے ہنسنے کی کوشش کرتے۔ لیکن ان کی ہنسی میں ایک رکاوٹ سی پوشیدہ ہوتی۔ جیسے ان کی آواز ان کی مرضی کے خلاف نکل رہی ہے۔ تین چار روز تو یہ بچے آتے رہے' پھر اچانک ان کا آنا جانا بند ہو گیا۔ چوتھے پانچویں روز ایک بچی چھپتی چھپاتی مایا کے پاس آئی اور بہت مدھم آواز میں بولی۔ "اب ہم کہانیاں نہیں سنیں گے۔"

مایا نے پوچھا۔ "کیوں؟"

کہنے لگی۔ "ماتا جی کہتی ہیں کہ ان گندی کوٹھریوں میں رہنے والیوں کا سایہ بھی پڑ جائے تو سارا جیون دکھی ہو جاتا ہے۔ پریاں تو ہیں ہی نہیں۔ کہتی ہیں یہ سب غریبوں کی من گھڑت باتیں ہیں اور اونچے رہنے والے ایشور کے زیادہ قریب ہوتے ہیں۔"

لیکن وہ بچی اکثر ہفتہ دس دن کے بعد مایا کے ہاں ہو جاتی تھی۔

گلی سے صبح و شام ایک نوجوان مہترانی بھی گزرتی تھی۔ اس کا صاف سانولا رنگ اور نکھرے نقوش دیکھ کر انسان کو دھوکا ہوتا تھا کہ کہیں کسی امیر گھرانے کی لڑکی نے تو جھاڑو نہیں اٹھالی۔ وہ جھاڑو دیتے ہوئے ہمیشہ ایک گیت

www.iqbalkalmati.blogspot.com

گنگنایا کرتی تھی'

پیتم تم بھی چلتے بنے
اپنی داسی کو ٹھکرا کر
آشا کے دیپک کو بجھا کر
پیتم تم بھی چلتے بنے

مایا کو اس مہترانی سے پریم سا ہو گیا تھا۔ وہ بڑے چاؤ سے اس کی منتظر رہتی اور جب وہ گلی کے آخری سرے سے "پیتم تم بھی چلتے بنے" مدھم لہراتی تان سنتی تو کوٹھڑی کی دہلیز پر آکر بیٹھ جاتی اور اس کا انتظار کرتی رہتی۔ وہ گلی میں جھاڑو دیتی ہوئی جب مایا کے قریب آتی تو مسکرا کر کہتی۔ "سلام بی بی جی۔"

"سلام" مایا جواب دیتی۔ لیکن اس کا دل پکار پکار کر کہتا۔ "بہن مہترانی' تیرا جیون مجھ سے کہیں اچھا ہے۔ میں تیرے اس محبت بھرے سلام کے لائق نہیں۔"

ایک روز رام دتی محلے میں کسی کو چادر دینے چلی گئی۔ مایا اکیلی بیٹھی اپنے دل کی دھڑکنیں گن رہی تھی کہ "پیتم تم بھی چلتے" کی رسیلی تان سے اس کا دل رک سا گیا۔ جب مہترانی اس کے قریب آئی تو اس نے پکار کر کہا۔

"بہن۔"

مہترانی کی جھاڑو اس کے ہاتھ سے گر گئی!

ایک اچھوت لڑکی کو ایک برہمن کی پتری بہن کہہ ڈالے! کیا سورج پچھم سے بھی ابھرتا ہے!

مہترانی حیرت زدہ ہو کر مایا کو گھورنے لگی۔

اس نے پوچھا۔ "آپ نے مجھے بلایا ہے؟"

"کچھ نہیں ذرا طبیعت خراب تھی۔ تمہارا گیت سنا تو خیال آیا کہ شاید

www.iqbalkalmati.blogspot.com

تم بھی میری طرح دکھی ہو۔"

"ہاں' بی بی۔ میں بہت دکھی ہوں۔ لیکن میرے دل کی بپتا سننے کے لیے تمہاری جوانی مناسب نہیں۔ میں نے بڑے بڑے دکھ بھوگے ہیں بی بی جی۔ تم ان کا حال سنو تو عمر بھر روتی رہو۔"

مایا کانپ اٹھی۔ اس دنیا میں ہر آتما دکھی کیوں ہے؟ اس باغ میں ہر پھول کے سینے پر داغ کیوں ہے؟

مہترانی نے پوچھا۔ "آپ کی ماتا کدھر ہے؟"

"محلے میں کہیں چادر دینے گئی ہیں۔"

"اچھا بی بی میں جاتی ہوں۔ تمہاری ماتا نے مجھے تم سے باتیں کرتے دیکھ لیا تو جانے کیا ہو جائے۔"

مایا کے کلیجے پر چوٹ سی لگی۔ ایک انسان دوسرے انسان سے صرف اس لیے بات نہیں کرسکتا کہ ایک جھاڑو دے کر اپنا پیٹ پالتا ہے' دوسرا چادروں پر بوٹیاں کاڑھ کر! یہ بھی کیا قانون ہے' اس قانون کو بنانے والا کون ہے! اس قانون کے چلانے والے کون ہیں! یہ مہترانی اپنے ہاتھ کی کمائی سے گزر اوقات کرتی ہے' میں دن بھر یہاں بیٹھی مکھیاں مارا کرتی ہوں اور پھر بھی یہ مجھ سے جھجکتی ہے!

دکھوں نے مایا کو بہت حساس بنا دیا تھا۔ بولی۔ "لیکن بہن' مجھے تم اپنی بپتا کا کچھ حصہ تو سنا ہی دو ورنہ میں پریشان ہو جاؤں گی۔"

مہترانی نے جھاڑو دیوار سے لگا دی۔ آنکھیں دور دھندلے خاکستری آسمان پر گاڑ دیں۔ اتنی گہری سانس لی کہ اس کا سینہ ابھرتا ہی چلا گیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے۔ اس کے ہونٹ کپکپانے لگے۔ اس کے گلے کی رگیں ایک ایک کر کے ابھرنے لگیں۔ بڑی دیر کے بعد بولی۔ "مایا دیدی۔ ٹوٹی سارنگی کیا خاک بجے گی۔ بجھا دیا کیا خاک راہ دکھائے گا۔ میں کیا بتاؤں میں نے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

پریم کیا ہے' میرا پریمی بہت سندر بہت بانکا چھبیلا جوان تھا۔ جب اندھیری راتوں کو میں شہر سے باہر کوڑا پھینکنے جاتی تھی وہ ایک جگہ میرا منتظر بیٹھا ہوتا تھا۔ میرا ہاتھ پکڑ کر مجھ سے کہتا تھا۔ "سنتو' لا یہ ٹوکری میں پھینک آؤں۔" پھر وہ مجھ سے میٹھی میٹھی باتیں کرتا تھا۔ میرے بالوں سے کھیلتا تھا۔ میری آنکھوں کو چومتا تھا۔ ان دنوں میں نے اتنی بھاری ٹوکریاں اٹھائیں کہ آج کوئی نوجوان بھنگن اٹھا دے تو جانوں۔ ایک بار شہر میں بھنگیوں نے ہڑتال کر دی۔ پلس نے حملہ کیا تو میرا پریمی ایک سپاہی کے ہتھے چڑھ گیا اتنے ڈنڈے کھائے کہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ پر پیچھے نہ ہٹا۔ ہسپتال اٹھا لائے۔ راستہ ہی میں ختم ہو گیا۔ مجھے پتہ چلا تو میں نے یوں سمجھا جیسے صاف سیدھی سڑک پر جاتے جاتے میں بہت گہرے کنوئیں میں گر گئی ہوں' اب بی بی' گاتی ہوں اور روتی ہوں' روتی ہوں اور گاتی ہوں۔ سوچتی ہوں' میں نے کیوں پریم کیا۔ پریم کیا تو اسے انت تک کیوں نہ نبھایا اور اگر انت تک نبھاؤں تو میری بوڑھی ماتا کی کون فکر کرے۔ وہ بھوکوں مرجائے گی۔"

مایا تھرا اٹھی۔ سنتو جھاڑو اٹھا کر چلدی۔ وہ دور تک اپنی میلی چادر سے آنکھیں پونچھتی گئی۔

مایا کے دل پر سنتو کی بات نے ایک ایسا گہرا نقش چھوڑا تھا کہ وہ دن بھر پریشان رہی اور ساری رات جاگتی رہی۔ اس کا دل اچھل اچھل کر اسے کہیں لے جانا چاہتا تھا۔ وہ چاہتی تھی' کچھ کرے لیکن کیا کرے؟ یہ بات اس کی سمجھ سے بالا تھی۔ وہ محسوس کرتی تھی کہ کوئی اس کے اتنا قریب ہو جائے کہ اس کی سانسیں اس کے چہرے پر کھیلنے لگیں۔ لیکن وہ کون ہو! ——— ماتا؟ ——— نہیں! تو پھر وہ کون ہو؟ مایا کی زندگی میں ماتا کے سوا کون تھا جو اس کے اتنا قریب ہو۔ اس کے روئیں روئیں میں درد بسنے لگا۔ جب اسکی ماتا چادریں دینے کہیں چلی جاتی تو مایا محسوس کرتی کہ کوئی اس کی اندھیری کوٹھڑی میں آگیا

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہے۔ ہر طرف نور ہی نور ہے۔ جدھر دیکھو وہی ہے۔ جس کونے میں چھپو وہاں موجود ہے۔ وہ اسے چھیڑتا ہے۔ اس کے بالوں سے' اس کے گالوں سے' اس کے ہاتھوں سے کھیلتا ہے! اس کا سینہ تپ رہا ہے۔ اس کے لب دہک رہے ہیں۔ اس کا سر گھوم رہا ہے۔ وہ اس کے قریب آجاتا ہے۔ بہت قریب آجاتا ہے۔ اس کی آنکھیں پتھرا جاتی ہیں۔ وہ کچھ نہیں دیکھ سکتی۔ وہ کچھ نہیں سوچ سکتی۔ وہ بیہوش ہو گئی ہے۔ جیسے وہ کہیں موجود نہیں۔ جیسے اس کی ہستی بھاپ بن کر اڑ گئی ہے اور اس اندھیری کوٹھری میں' باہر دھندلی گلیوں میں' اونچے بالا خانوں پر' گرم فضا میں' خاکستری آسمان پر ہر طرف وہی چھایا ہوا ہے ——— یہ "وہی" کون ہے؟

اس کی ماتا حیران رہنے لگی۔ اسے معلوم نہ تھا کہ مایا اندر ہی اندر چولا بدل رہی ہے جب وہ چلی جاتی ہے تو کوئی اس اندھیری کوٹھڑی میں آتا ہے اور اس کی مایا سے اتنا کھیلتا ہے کہ وہ گھبرا جاتی ہے۔ آخر ایک دن رام دتی نے اپنی بیٹی سے یہ بات پوچھ ہی لی۔ "مایا پتری تو چپ چپ کیوں رہتی ہے؟"

مایا بولی۔ "ماتا جی' نہ جانے کیا بات ہے۔ جی چاہتا ہے' ایسی چپ سادھ لوں کہ پھر کبھی نہ بولوں۔ آپ کے دم سے ہر چیز موجود ہے۔ کسی شے کی کمی نہیں۔ پر جانے یہ سارا سنسار ویران کیوں نظر آتا ہے۔ ماتا جی' یہ کوئی بیماری تو نہیں؟"

"رام رام کر بیٹی' رام رام کر۔ ایشور بیماریوں سے بچائے۔ اصل میں کوٹھڑی تنگ ہے نا۔ بدبودار گلیاں' ہوا گندی۔ میں بھی کچھ ست رہنے لگی ہوں۔"

مایا دیر تک سوچتی رہی کہ شاید اس کی گھبراہٹ کی یہی وجہ ہو! ——— شاید یہ آب و ہوا کا اثر ہو! شاید ———!

کچھ دنوں کے بعد گلی میں سے ایک اور شخص بھی گزرنے لگا۔ یہ ایک

www.iqbalkalmati.blogspot.com

نوجوان تھا۔ انگریزی لباس' داڑھی مونچھ صاف' پانچ منزلوں والے مکان کی طرف چلا جاتا اور جب واپس ہوتا تو مایا کی کوٹھڑی کے سامنے سے یوں گزر جاتا جیسے وہاں کوئی ذی نفس آباد ہی نہیں۔ سیٹی بجاتا زیر لب کچھ گنگناتا' نظریں پھیرے بغیر بے پروائی سے آگے بڑھ جاتا——

اور مایا سوچا کرتی یہ نوجوان کون ہے۔ اور یہ یہاں سے گزرتے وقت مجھے دیکھتا کیوں نہیں اور میرا دل اس کی طرف کیوں کھنچا جا رہا ہے اور میں کیوں چاہتی ہوں کہ یہ میرے پاس آکر مجھ سے باتیں کرے اور میری انگلیاں اس کی انگلیوں کو ڈرتے ڈرتے چھوئیں اور یہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکرائے۔ کیا یہ "وہی" تو نہیں ہے! اگر یہ وہی ہے تو میری اندھیری کوٹھڑی کو بقعۂ نور کیوں نہیں بناتا! یہ تو یہاں سے گزرتے وقت ادھر دیکھتا تک نہیں۔ پھر یہ کون ہے۔ اور میرا اس سے کونسا روحانی تعلق ہے کہ یہ میرے سنسان طویل دنوں اور ویران اجڑی راتوں پر چھایا جا رہا ہے۔

جب اس کی ماتا باہر چلی گئی تو وہ دہلیز پر بیٹھ کر اس پانچ منزلوں والے مکان کو دیکھتی رہی اور خود ہی ننھے ننھے گیت بنا کر گاتی رہی—— ایک روز اس نے ایک گیت گایا۔ ؎

اونچے بسنے والے پیتم آجا میرے پاس
تجھ بن مجھ بے بس دکھیا کی ہر ہر سانس اداس
کون بندھائے آس
پیتم
آجا میرے پاس

مڑ کر دیکھا تو مہترانی کھڑی دھیرے دھیرے جھاڑو ہلا رہی تھی۔ "بی بی سلام۔ بڑا دکھی گیت گایا۔ کس کا ہے؟"

"چنڈی داس کا۔" ——اور مایا اپنے آپ کو واقعی چنڈی داس ہی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

سمجھنے لگی۔ جس نے رادھا کی زبانی برہمن کے گیت کہلوا کر تباہ حال استریوں کے ہردے مول لے لیے! اب مایا کا خاص مشغلہ جذبات بھرے گیت کہنا اور گانا تھا!

راتوں کو جب اس کی ماتا گنیش داس سرگباشی کی باتیں کرتے کرتے سو جاتی تو مایا چارپائی سے اٹھتی اور باہر دہلیز پر بیٹھ کر اونچے بالا خانے پر نظریں گاڑے رکھتی۔ جب تارے ٹمٹماتے اور اندھیری رات تنگ گلیوں میں سائیں سائیں کرنے لگتی تو مایا اپنے وہ گیت گنگنانے لگتی جو اس نے بھگوان جانے کس مستی میں آکر کہے تھے' اور جنہیں گا کر وہ یوں محسوس کرتی جیسے اس کی ساری آشائیں پوری ہو گئیں۔

کئی بار وہ نوجوان گلی سے گزرا' پر اس نے پلٹ کر مایا کی طرف نہ دیکھا۔ مایا ایک بار گلی کے عین وسط میں ٹہلنے کے بہانے سے چلی گئی۔ وہ آیا اور ایک طرف سے ہو کر نکل گیا۔ اس دن مایا اس قدر روئی کہ آنکھیں گھنٹوں سرخ رہیں۔

ایک رات اچانک اس کی ماں کے پیٹ میں درد اٹھا۔ وہ سب کچھ بھول گئی۔ گھر میں جو کچھ میسر آسکا استعمال کیا۔ سونف' پنیر کالا نمک' خشم ہریڑ۔ لیکن' رام دتی کو افاقہ نہ ہوا۔ اگلا دن بھی اسی درد و کرب میں گزرا۔ ایک بار مایا نے دیکھا کہ وہی نوجوان جاتے جاتے رک گیا ہے اور اس کی بوڑھی ماں کی طرف حسرت بھری نظروں سے دیکھ رہا ہے۔ اسے اپنی گزشتہ ناکامیوں اور ماں کی پریشان کن علالت کے دکھ بھول گئے!

رات کو رام دتی اسی طرح چیختی رہی۔ دوسرے دن صبح کو اس کی حالت نازک ہو گئی۔ وہ نوجوان کوٹھڑی کے دروازے تک آیا اور بولا۔ "کیا حال ہے ماتا جی کا؟"

مایا کچھ جواب نہ دے سکی۔ اس کا گلا گھٹ گیا۔ آنسو امڈ آئے۔ زبان لرزی مگر کوئی لفظ نہ ڈھال سکی۔ نوجوان مغموم اور اداس واپس چلا گیا

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اور مایا اس دہری ناکامی پر بلک بلک کر روئی۔ ادھر اس کا رونا بند ہوا' ادھر رام دتی کی پتلیاں پھر گئیں۔ مایا پکاری۔ "ماتا جی۔ ماتا جی۔"

رام دتی کے نحیف لب لرزے اور دھیمی سی آواز آئی۔ "بھگوان دیا۔ دیا بھگوان۔"

ایک مرنے والی اور ایک رونے والی ——— ساری دنیا میں تنہا۔ سارے سنسار میں اکیلی! مایا کی چیخوں سے متاثر ہو کر ننھی سمتراں اور سنتو مہترانی دوڑی آئیں اور اس کے پاس بیٹھ کر رونے لگیں مگر اور کوئی نہ آیا۔

وہ اب ماتا کے خشک پنجر کو کہاں لے جاتے۔ اس کے پاس ایک کوڑی تک نہ تھی اور گھر میں اتنا سامان نہ تھا کہ بیچ کر چتا کے لیے لکڑیاں خریدی جاسکتیں۔ کریا کرم پر تو بہت خرچ آتا تھا!

چار گھنٹے کے بعد دس بارہ آدمی آئے۔ انہوں نے رام دتی کی لاش اٹھائی۔ مایا روتی چیختی ان کے پیچھے ہولی۔ چتا تیار تھی۔ آگ بھڑکی اور پھر ہر طرف دھواں ہی دھواں تھا۔

"ماتا۔"

لکڑیوں کی چیخ پکار کے سوا اور کوئی صدا سنائی نہ دی!

وہ گھر کو لوٹی جیسے کوئی مسافر اپنا سب کچھ کسی رہزن کے حوالے کر کے خستہ و درماندہ کسی طرف منہ اٹھا کر چل دیتا ہے۔

راستے میں اسے سمتراں ملی۔ اداس چہرہ' مری چال۔ مایا نے پوچھا۔ سمتراں تجھے کیا ہو گیا۔"

ننھی بولی۔ "آج بھیا رو رہے تھے۔ کہتے تھے مایا کو بہت دکھ پہنچا۔"

وہ سمتراں کو وہیں چھوڑ کر تیزی سے اپنی کوٹھڑی کی طرف چل دی۔ اس کا دماغ گھومنے لگا۔ جیسے اس نے بہت تلخ شراب پی لی ہے۔

دروازے پر پہنچی' اندر جانا چاہتی تھی کہ پیچھے سے اسے کسی کے پاؤں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کی چاپ سنائی دی۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ وہی نوجوان آہستہ آہستہ اس کی طرف آ رہا تھا۔

وہ اس کے قریب آ کر رک گیا اور بولا۔

"کسی چیز کی ضرورت ہو تو مجھے کہہ دیا کرو۔"

مایا کے دل میں بجلی کی سی کڑک بلند ہوئی۔ اس نے آنکھیں جھکا کر پوچھا۔ "تو کیا کریا کرم پر آپ نے خرچ کیا؟"

وہ خاموش رہا اور پھر کچھ دیر کے بعد بولا۔ "اور کسی چیز کی ضرورت ہے؟"

مایا نے اسی انداز سے جواب دیا۔ "میرے کریا کرم پر بھی آپ ہی خرچ کیجئے گا، اور ———"

"اور کیا؟" نوجوان نے پوچھا۔

مایا نے سامنے دیکھا۔ نوجوان کی نظریں جھک گئیں!

مایا کی جیسے کسی نے دل کی گرہ کھول دی۔

* * *

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بچے

والد نے جو اثاثہ چھوڑا تھا وہ ہم میاں بیوی کے لیے کافی تھا۔ مرغن کھانے اور ریشمی کپڑے نہ سہی' لیکن بہرحال ہم زندہ رہ سکتے تھے۔ دن بھر لاہور کے بازاروں کے چکر کاٹنا اور رات کو گھر آ کر مزے سے سو جانا۔ بس یہ میرا معمول تھا' لیکن اچانک میرے عزیزوں نے میرے خلاف ایک سازش سوچی اور تعجب کی بات یہ ہے کہ بیگم بھی ان کی ہمنوا ہو گئی۔ سب کہنے لگے کہ نوکری پر جاؤ۔ ہزار بار کہا نوکری صرف اس لیے کی جاتی ہے کہ پیٹ بھرنے کی کوئی سبیل مہیا ہو جائے اور یہاں ہم اللہ کے فضل سے خالی پیٹ کبھی نہیں سوئے لیکن وہ نہ مانے۔ دوڑ دھوپ شروع ہوئی۔ درخواستیں لکھنے کا فن سیکھنا پڑا اور آخر دہلی کی ایک فرم میں تیس روپے ماہانہ کی ایک نوکری مل گئی ———

تیسرے درجے کا ٹکٹ انگلیوں میں دبائے میں دہلی سٹیشن پر ٹہلتا پھر رہا تھا۔ آج میں چھ ماہ بعد لاہور جا رہا تھا۔ کیونکہ بیگم کا خط آیا تھا کہ جلدی پہنچو۔ جلدی پہنچنے کی وجہ سوائے اس کے اور کوئی نظر نہ آئی کہ "میں اداس ہوں۔" ——— میں بھی اداس تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ مرد کی اداسی عورت کی اداسی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کے سامنے کچھ حیثیت نہیں رکھتی۔ عورت اداس ہو جائے تو مجھے ساری کائنات اداس نظر آنے لگتی ہے۔

نو بجے کا وقت تھا جب گاڑی دہلی کے سٹیشن سے گرجتی ہوئی لپکی تو میں نے سارے کمرے پر ایک پھسلتی ہوئی نگاہ ڈالی اور پھر اخبار کے اس ٹکڑے کی عبارت پڑھنے لگا جس میں مجھے پکوڑیاں لپیٹ کر دی گئی تھیں:۔

راولپنڈی 7 - جنوری - پشاور سے آتی ہوئی ٹرین کے تیسرے درجے کے ایک چھوٹے سے ڈبے میں ایک نوجوان کی لاش پائی گئی جس کی جیب سے ایک خط اس مضمون کا نکلا۔ "بھوک میرا پیچھا نہیں چھوڑتی۔ بھوکا رہا نہیں جاتا اور بھوک دور کرنے کا جو علاج سوجھتا ہے رائیگاں جاتا ہے۔ اس لیے افیون کھا کر سو رہا ہوں۔ جہاں لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ میں مرچکا ہوں' مجھے کھڑکی کے باہر پھینک دیں۔ کیونکہ میں ان بھوکی چیلوں اور فاقہ کش گدھوں کی غذا بننا چاہتا ہوں جنہیں مدت سے کوئی مردہ جسم نہیں ملا۔ میری بیوی کو چاہئے کہ اپنے ننھے کی حفاظت کرے اور میرے بعد اداس نہ رہے۔ کیونکہ عورت اداس ہو جائے تو مجھے ساری کائنات ـــــــ"

یہاں سے آگے کاغذ پھٹ چکا تھا۔ تختوں پر لیٹے ہوئے مسافر مجھے زرد اکھڑی ہوئی لاشوں میں تبدیل ہوتے نظر آئے۔ اور ان مُردوں کے جمگھٹ میں اپنے آپ کو زندہ محسوس کر کے میرا کلیجہ برف کی طرح یخ ہو کر رہ گیا! یہ احساس ایک خوفناک صورت اختیار کرنے لگا جیسے کوئی جی میں پھنکار رہا ہے۔ یہ انجن نہیں ملک الموت ہے اور ہم سب مردہ انسان ہیں' جو اس زمین سے بہت دور ابدی آگ کی لپٹوں میں جھلس کر انگارہ ہونے کے لیے بے تحاشہ چلے جا

www.iqbalkalmati.blogspot.com

رہے ہیں' ـــ سامنے خطرے کی زنجیر نے سرہلا کر جیسے مجھے اپنی طرف بلوایا۔ اور میں اپنے ہم جنسوں اور سب سے زیادہ خود اپنے آپ کو بچانے کے لیے اس پر جھپٹا کہ ایک بوڑھے کی کھانسی نے مجھے اس انجنوں' پٹڑیوں اور ریلوں والی دنیا میں لا ڈالا۔ میں نے آنکھیں ملیں' سر کھجایا' انگلیاں چٹخائیں اور اپنے دائیں طرف نظر ڈالی۔ وہی بوڑھا بوری کا ایک ٹکڑا جلا کر چلم پر رکھ رہا تھا۔ مگر کھانسی کے جھٹکوں سے چمٹے کی گرفت ڈھیلی پڑ جاتی اور ٹکڑا فرش پر گر جاتا۔ اس کے قریب ایک بچہ گنڈیریاں چوس رہا تھا اور اس کی انگلیوں' ہونٹوں اور ناک پر بے شمار مکھیاں پنجے گاڑھے بری طرح چمٹی ہوئی تھیں! ـــ پرلی طرف ایک بڑھیا اونگھ رہی تھی۔ اس کے بے رنگ مسوڑے جو دانتوں کا بوجھ اتار چکے تھے۔ خشک ہونٹوں کے ورے نظر آرہے تھے اور اس کی زبان سرخ سی گیند بنی اس کے گلے کے پاس پڑی سو رہی تھی۔ ایک طرف ایک لالہ جی چادر کے پلو سے روپے کھول کر گن رہے تھے اور جب کوئی پیسہ ان کی برق رفتار انگلیوں سے کھسک کر فرش پر گر جاتا تو وہ اس پر باز کی سی تیزی سے جھپٹتے اور قریب ہی لیٹا ہوا لٹھ بند دہقان ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھتا اور پھر انہیں گھورتا ہوا گھٹنے سمیٹ کر سو جاتا! ایک اندھا لاٹھی کو زمین پر لٹائے بیت الخلاء کے دروازے سے پیٹھ لگائے بیٹھا تھا۔ اس کی آنکھیں تازہ گوشت کی طرح سرخ تھیں! ایک بھینگی نوجوان عورت اپنے ننھے کو ایک چھاتی سے لٹکائے ایک بوقلموں دوپٹے کو سر پر اوڑھنے کھسکانے اور پھر اوڑھ لینے کے شغل میں مگن تھی! اس کے بالوں میں ایک جاپانی کلپ چمک رہا تھا اور میلی کلائیوں میں جاپانی چوڑیاں! ـــ اوپر تختے پر لوہے کا ایک تھرڈ کلاس بکس پڑا تھا جس کا قفل بار بار بکس سے ٹکرا کر سارے کمرے والوں کو جیسے وقت کی تیز گامی سے خبردار کر رہا تھا۔ سب تیسرے درجہ کے لوگ اور سب تیسرے درجہ کی چیزیں۔

بائیں جانب ایک لمبے تختے پر پانچ ننھے ننھے بچے بیٹھے تھے اور ان کے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

درمیان ان کی ماں تنگ تختے پر بہت مشکل سے آلتی پالتی مارے جم کر بیٹھنے کی کوشش میں مصروف تھی۔ اس کی ناک بہت چپٹی تھی اور رنگ بہت سیاہ ——— اس نے کلائیوں میں کنگن پہن رکھے تھے جو اس کی چوڑیوں سے ٹکرا کر بار بار بجتے تھے۔ ننھے بچے لپک لپک کر اس کی گود میں آتے۔ وہ انہیں چمکارتی، پچکارتی، کسی کا ماتھا چوم لیتی، کسی کی ٹھوڑی پکڑ کر مسکراتی۔ ادھر ایک ہاتھ میں ریوڑی تھما دی۔ ادھر دوسرے کی قمیض کا بٹن چڑھا دیا۔ بات بات پر ہنستی اور اس کے چوڑے دانت بجلی کی روشنی میں چنگاریاں بن جاتے ——— سب سے چھوٹا بچہ اس کی گود میں بیٹھے بیٹھے ہمک کر ایک شخص کے پاس جا گرتا جو ان سب کے مقابل والے تختے پر اونگھ رہا تھا۔ وہ نیم خوابیدہ حالت میں ننھے کے آبنوسی گالوں کو تھپکاتے ہوئے کہتا۔ "لے بھاگ جا امی کی گود میں۔ دلّو تیری جگہ لے لے گا اور تو پڑا روئے گا۔" ——— اور بچہ ہونہار آنکھیں جھپکاتا ہوا کھسکتا ہوا بدصورت عورت کی گود میں آ جاتا۔ گاڑی کا شور ان بچوں کی چیخ دھاڑ کے نیچے دب گیا اور میری ساری توجہ ان بچوں نے کھینچ لی۔

ان سب کی عمروں میں تدریج ایک ایک سال کا فرق ہوگا ——— سب کی ناکیں چپٹی تھیں اور سب کے رنگ کالے۔ موٹے موٹے ہونٹوں تلے ان کے چوڑے چوڑے دانت چمک رہے تھے اور فرش پر بکھرے ہوئے پھلوں کے چھلکوں پر سے مکھیاں اڑ کر ان کے نتھنوں کے اردگرد بھنبھنا رہی تھیں۔ کبھی کبھی کھیلتے دو بچوں کے سر ٹکرا جاتے تھے۔ تیسرے کے ہاتھ سے سفید ربڑ کی پھٹی ہوئی گیند جو انگلی کے ذرا سے مس سے پچک پچک جاتی تھی، چھوٹ جاتی۔ ادھر ایک کا ہاتھ سوئے ہوئے مضبوط اور جسیم دہقان کے آہنی گھٹنے تلے دب جاتا اور دوسرے کو اس کی ماں کھڑکی میں سے لٹک جانے پر زور سے پیچھے کھینچتی اور اس کی ٹھوڑی سے خون پھوٹ پڑتا تو سب منہ کھول کر اور آنکھوں کو الٹے ہاتھوں مل مل کر رونے بسورنے لگتے۔ اس کے بعد ماں باپ کو انہیں خوش

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کرنے کی مہم پیش آجاتی۔ ماں کسی کی گدگدی کر رہی ہے تو باپ کسی کے کانوں میں بھونڈے گیت گا رہا ہے! ماں تالو اور زبان کی مدد سے پٹاخے چھوڑ رہی ہے تو باپ بوڑھے بلے کی سی میاؤں سے سب کو خوش کر رہا ہے! کوئی کھلکھلا کر ہنس پڑتا اور بھیگی ہوئی پلکوں پر اس کے شفاف آنسو بھی مسکرانے لگتے۔ کوئی رونا بند کر دیتا اور تعجب سے ماں باپ کو گھورنے لگتا۔ کوئی سسکتا رہ جاتا اور ماں کے داہنے گھٹنے کے تلے دھری ہوئی گٹھڑی کی طرف تب تک جھک جھک کر دیکھتا رہتا جب تک میٹھی روٹی اور گڑ میں لپٹے ہوئے چنے اس کی جھولی میں نہ ڈال دیئے جاتے۔

باپ نے ایک بار سونا چاہا تو ایک ننھے نے اس کی ناک کھینچ لی مگر وہ اٹھا تو ہنستا ہوا! ادھر ماں اونگھنے لگی اور ایک نے اس کی لمبی لمبی بالیوں اور الجھے ہوئے بالوں سے زور آزمائی کرنا شروع کر دی اور وہ ننھی مٹھی سے بالوں کی جٹائیں اور بالی چھڑا کر اٹھی تو پیار سے اس کے گال تھپک دیئے!

یہ کیسے ماں باپ ہیں اور یہ کیسے بچے ہیں! میں نے سوچا! یہ باپ اپنے بچے پر برستا کیوں نہیں اور یہ ماں اپنے ننھے کے منہ پر کنگن سمیت ایسا بھرپور ہاتھ کیوں نہیں جماتی کہ وہ آرام سے بیٹھ رہے؟ ان شرارتوں کی کلوں سے یہ دونوں روحیں تنگ کیوں نہیں آجاتیں؟ انہیں اپنے بدصورت بچوں سے کیا امیدیں ہیں؟ ان غلیظ بھونڈے چھوکروں میں کونسی خصوصیت ہے' جس کے نیچے ان دو روحوں نے اپنی بے آرامی اور تکالیف کو چھپا رکھا ہے؟ ——اور پھر اس اخبار کے پرزے والا باپ! ——خودکشی کر رہا ہے اور بیوی سے بچے کی حفاظت کی استدعا جاری ہے! آخر اس ملک کے بچوں کو بڑے ہو کر ملک اور قوم کے لیے وہ کونسی مہمیں سر کرنی ہیں کہ ان کے وجود اس قدر عزیز رکھے جائیں!

میں نے آگے بڑھ کر ان بچوں کے باپ سے پوچھا۔ ''آپ کہاں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

جائیں گے۔"

"قصور۔"

"کیا کام ہے وہاں؟"

"ولیم صاحب کا پنکھا قلی ہوں؟"

"کیا تنخواہ ہے؟"

"نو روپے!"

——نو روپے اور یہ سات وجود! یہ کیا کھاتے ہوں گے اور جو کچھ کھاتے ہوں گے اس کے بل پر کیسے جیتے ہوں گے! تلخ حقائق کے نشتروں نے میرے احساسات کو چھلنی کرنا شروع کیا تو بھینگی عورت اپنے بچے کے منہ کو ایک چھاتی سے دوسری چھاتی کی طرف منتقل کرتی ہوئی میرے سامنے انگڑائی بن کر بیٹھ گئی اور —— میں سوچنے لگا کہ اس رنگا رنگ دنیا کا ہر پہلو کس قدر مختلف ہے۔ یہ اخبار کا پھٹا ہوا پرزہ —— یہ بیگم کا خط —— یہ سوتے ہوئے اونگھتے ہوئے تھکے ہوئے مسافر —— یہ بدصورت ماں اور یہ بھدا باپ! —— یہ سیماب کی طرح تڑپتے ہوئے بے آرام بچے اور یہ جاپانی کلپ والی بھینگی نوجوان عورت —— یہ کھڑکھڑاتی ریل اور یہ پھنکارتا انجن —— یہ قدم قدم پر منزلیں اور گام گام پر سفر کی ابتدا! —— یہ آرزوئیں اور یہ امیدیں —— یہ غلام ہندوستان اور یہ کلکاریاں مارتی ہوئی نئی پود —— یہ سب کیا ہے! یہ کیا ہنگامہ ہے۔

یہ نوجوان جس نے اپنی مفلسی کے ہاتھوں خودکشی کی ہے، اگر زندہ رہتا، اگر کچھ روز اور فاقے کاٹتا تو ہندوستان میں ایک بیوہ اور ایک یتیم کی تعداد کم ہو جاتی —— اور مر کر بھی ننھے بچے کی پرورش کی تلقین —— ایک ایسے بچے کی دیکھ بھال جو بڑا ہو کر غلام بنے، اہلِ زر کے تلوے چاٹے، ماتھا رگڑے اور پھر بھی بھوکا رہے اور باپ کی طرح افیون کھا کر گاڑی کے تیسرے درجے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

میں پڑ رہے ـــــ اور پھر یہ مسافر کدھر جا رہے ہیں اور ـــــ اور دور بوڑھا حقہ نوش حقے کی نال اپنے پوپلے منہ میں جمائے رکھنے کی کوشش میں مصروف تھا۔ گنڈیریاں چوسنے والا ایک لڑکا کھڑکی سے سر لگائے سو رہا تھا اور مکھیاں اس کے چہرے پر بھنبھنا رہی تھیں اور اس کے نتھنوں، باچھوں اور آنکھوں کے گوشوں میں گھسی پڑتی تھیں، اس کی پتلیاں نیند کے بس میں آکر اوپر چڑھ گئی تھیں اور قمقموں کی روشنی میں اس کی نیم وا آنکھیں پتھرائی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ لیٹی ہوئی بڑھیا سینے پر مٹھیاں بھینچے کھانس رہی تھی! لالہ جی پوٹلیوں پر ہاتھ پھیر رہے تھے اور دہقان اپنی ایڑیوں کی دراڑ میں سے پھوٹتے ہوئے خون کو اپنی چادر کے ایک کونے سے پونچھ رہا تھا کہ اچانک ڈبے میں ہڑبونگ مچ گئی۔ لوگ ہڑبڑا کر اٹھے اور اوپر تختوں سے کھوپڑیاں ٹکرا کر پھر نیچے دبک گئے۔ بچے چلا اٹھے۔ بوڑھے کا حقہ الٹ گیا۔ بدصورت ماں اور باپ ان وحشیوں کی طرح چیخ رہے تھے جن کے دیوتا پر کوئی آنچ آگئی ہو!

بیوی کھڑکی سے ناف تک لٹکتی ہوئی پیچھے دیکھ کر چیخ رہی تھی۔ میرا ننھا ہائے میرا ننھا۔ میرا لال۔ ہائے میرا منا ہائے ـــــ" اور باپ بہت دور پھنکارتے ہوئے انجن کی طرف دونوں بازو ہلا ہلا کر پکار رہا تھا۔ "اے ڈریور! اے انجن چلانے والے! ـــــ اے میرا منا گر گیا ہے ـــــ مجھ غریب کا خزانہ لٹ گیا ـــــ ذرا کسی بٹن کو کھینچ لے ـــــ اے ـــــ" لیکن کھڑکھڑاتے پہیوں اور گرجتی بھاپ کے شور میں اس کی چیخیں بیوی کے پریشان بالوں کی طرح پیچھے اڑ گئیں! میں لپک کر اس کے قریب آیا اور اسے اندر کھینچ کر پکارا۔ "اے یہ زنجیر کھینچ یہ خطرے والی زنجیر۔ یہ ـــــ لٹک جا اس سے ـــــ زور سے کھینچ ـــــ اور زور سے ـــــ گاڑی رک جائے گی اور تم اپنے ننھے کو اٹھا لانا ـــــ" اور جب گاڑی کی رفتار مدھم ہونے لگی تو ایک بار سرد ھنتی ہوئی ماں نے گاڑی کے اندر جھانکا۔ میں نے اس

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کی آنکھوں میں شعلے بھڑکتے دیکھے۔ اس کے بال بچی کھچی جھاڑی کی طرح نظر آرہے تھے اور اس کا کالا چہرہ آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا! اس کے چولے کے کمزور بٹن ٹوٹ گئے اور اسے اپنی عریانی کا کوئی احساس نہ تھا۔ اس نے پھر ایک آسیب زدہ کی طرح آنکھیں پھاڑ کر باہر جھانکنا چاہا مگر ماتھا کھڑکی سے ٹکرا گیا اور چوڑیاں تختے سے۔

رنگ برنگ چوڑیاں کرچی کرچی ہو کر گنڈیروں کے آس پاس بکھر گئیں اور اسکی کلائیوں اور ماتھے سے خون نکل پڑا۔ لیکن آن کی آن میں اس کا آدھا دھڑ کھڑکی سے باہر لٹک گیا۔ بھدا باپ بار بار اپنے پاؤں فرش پر سے اٹھاتا اور رکھ دیتا۔ جیسے تپتے تانبے پر کھڑا ہے۔ رو رو کر مجھ سے پوچھتا۔ "بچ جائے گا لڑکا؟" اور میں اسے تسلی دیتے ہوئے کہتا۔ "جب تم کہتے ہو کہ بچہ ریت پر گرا ہے تو اگر نرم ریت پر ہے تو اسے کیا چوٹ آئی ہوگی۔ ذرا سی تو جان ہے۔ بہت وزنی جسم ہوتا تو شاید زخمی ہو جاتا۔ مزے سے لیٹا آسمان پر نظریں گاڑے انگوٹھا چوس رہا ہوگا۔" ادھر مسافر ایک ایک کھڑکی سے چار چار سر باہر نکالے چہ میگوئیاں کر رہے تھے۔ "ریت پر گرا ہے—— نہیں' ساتھ ساتھ پھیلے ہوئے کنکروں پر پٹخا تھا!—— اور کنکریوں پر!—— مر گیا ہوگا—— شاید نہ مرا ہو—— بے چارا—— بس یوں ہمک کر گیند کی طرح باہر جا گرا—— چچ چچ چچ چچ!!"

اور ان دو چار لمحوں میں میں نے سوچا کہ یہ ماں باپ کتنے دیوانے ہیں۔ دیوانے اور بے وقوف۔ پانچ بچوں میں سے ایک ننھا سا غلیظ چھوکرا کم ہو جائے تو وہ اس قدر چیخ چلا کیوں رہے ہیں۔ کیا یہ چار بھونڈے چھوکرے ان کی امیدوں کے محل میں ستونوں کا کام نہ دے سکیں گے؟—— کیا مادرِ ہندوستان کی گود کو ایک اور غلام سے بوجھل کرنے میں ہی سعادت مندی ہے!—— اس ایک ننھے میں کیا جادو بھرا تھا کہ پاگل ہو رہے ہیں دونوں۔ گاڑی سے باہر

www.iqbalkalmati.blogspot.com

لٹکے جا رہے ہیں —— اور اگر ادھر سگنل والا کھمبا دماغ سے ٹکرا گیا تو پڑے ایڑیاں رگڑیں گے!

گاڑی ابھی پوری طرح نہیں رکی تھی کہ میاں بیوی نے چھلانگ لگا دی۔ ان کے چہرے مہین دھول سے اٹ گئے۔ خاک کا ایک طوفان اڑاتے وہ بھاگے اور آن کی آن میں بہت دور نکل گئے۔ گارڈ بغل میں جھنڈیاں دبائے ہانپتا ہوا آیا اور پکارا "کون تھا زنجیر کھینچنے والا؟"

ہم سب نے بھتنوں کی طرح اڑتے ہوئے دونوں میاں بیوی کی طرف اشارہ کیا جن کے ڈھیلے ڈھالے لباس پھڑپھڑا رہے تھے اور جن کے کالے کلوٹے بچے منہ کھولے، ناکیں سڑسڑاتے چیخ رہے تھے۔ گارڈ نے جھنڈیوں کو ایک بغل سے نکال کر دوسری بغل میں دباتے ہوئے کہا "یہ تھرڈ کلاس والا لوگ بہت تنگ کرتا ہے۔ کیا گرا ہے ان کا؟"

"میں نے کہا۔ "بچہ۔"

اور گارڈ جھنڈیوں کو پرلی بغل سے نکال کر انگلیوں میں گھمانے لگا۔ اسکی بھوئیں جھک آئیں اور پتلیاں پھیل گئیں۔ بولا۔ "اوہ! بچہ! چچ چچ چچ چچ!"

اور چوسی ہوئی گنڈیریوں پر مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔ جاپانی کلپ والی جھینگی عورت اپنے ننھے کی ناک پونچھ کر بولی۔ "یہ کانچ کے کھلونے یوں الگ چھوڑ دیئے جائیں تو سمجھو بس ٹوٹ گئے۔ میں نے تو اپنے ننھے کو کبھی کلیجے سے جدا نہیں کیا۔" —— اور اس ننھے نے اچانک مُوت دیا اور وہ اسے تختے پر تقریباً پٹخ کر بڑبڑائی۔ "موئے تھوڑا دودھ پیا کرو۔ ہر وقت چپ چپ لگائے رکھتا ہے!"

اور اس کے سر پر سے دوپٹہ کھسک گیا۔ "اوئی!" وہ میری طرف دیکھ کر منمنائی اور اس کی ترچھی آنکھ کی ایک پتلی ایک طرف پھسل کر کہیں غائب ہوگئی۔ اس طرف بڑھیا، جس کے مسوڑھے دانتوں کا بوجھ اتار چکے تھے،

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"بولی۔ اے بٹی یہ دوپٹہ کا ہے کا ہے!"

"ریشم کا۔" اس نے اپنے بچے کو کلیجے سے لگاتے ہوئے کہا۔ "ولایتی ریشم ہے۔ ننھے کی پیدائش پر بھیانے خرید دیا تھا——جالندھر سے!"

"تبھی تو تیرے سر پر نہیں ٹھہرتا۔ ولایتی ریشم ہے نا——اور بٹی جالندھر میں ریشم بنتا ہے کیا!"

اور وہ مسکرا کر بولی۔ "نہیں ری بھولی خالہ! جالندھر میں تو لدھیانے کا کپڑا بنتا ہے۔ ولایتی ریشم تو ہانگ کانگ میں بنتا ہے کیونکہ وہاں ریشم کے درخت پالے جاتے ہیں!"

اور یک بیک شور مچ گیا۔ میاں بیوی بچے کو اٹھائے پٹڑی کے دونوں طرف اگے ہوئے سرکنڈوں میں سے نکلے۔ ان کے بچے چیخ چیخ کر کھڑکیوں سے لٹکنے اور دروازوں سے کودنے کے لیے بیتاب ہو گئے۔ جب وہ ہمارے قریب پہنچے تو بچہ اپنے ننھے ننھے سیاہ بازو آسمان کی طرف اٹھائے ہنس رہا تھا اور بدصورت ماں باپ اس زور سے ہانپ رہے تھے۔ جیسے ہمالہ کو عبور کر کے آ رہے ہیں!

اس کے بعد بہت دیر تک ریلوں' بچوں کے گرنے اور ماؤں کی غفلت کے متعلق باتیں ہوتی رہیں۔ "یہ ریل نہیں یہ تو موت ہے، موت" —— "میرا ننھا اٹک کے پل پر سے ہمک کر گر گیا تھا دریا میں۔" —— "بس خود لمبی تان کر سو رہتی ہیں اور ننھے من مانی کرتے ہیں۔" —— "ماتا ختم ہو گئی!" —— موضوع بدلنے لگے' نوجوانوں کا خودکشی سے مرنا —— نوکری کا فقدان —— انگریزی تعلیم کی تباہی —— ملک کی افسوسناک حالت —— غلے کے چڑھے ہوئے نرخ —— جنگ کی ہولناکیاں —— گاندھی' جناح —— پیر زرد پوش علیہ الرحمتہ —— تعویذ گنڈے —— قوالی —— بائی گلزار جان —— لاہور کا ٹبی بازار —— لاہور کی منڈی —— گندم کا بھاؤ اور روٹی کی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کمی ——— اور نہر میں پانی بہت کم ہے ——— "بیگار پر نہ پکڑیں تو سچے دل سے خدمت کریں۔" ——— "دھوبی کی بیٹی دن دہاڑے اغوا ہوگئی ——— سرحد پار کا ایک پٹھان ہینگ بیچنے آیا پھسلا کر لے گیا!" ——— اور اس طرح دنیا جہان کی تھرڈ کلاس باتوں پر بھونڈے مگر بے باک انداز میں خیال آرائی کے بعد یہ لمبی لمبی لٹھوں اور غلیظ حقوں والے اپنی اپنی منزلوں پر تیسرے درجے کے ڈبوں سے اترتے چلے گئے!

اور گنڈیریوں کے چھلکوں پر مکھیاں اسی طرح بھنبھناتی رہیں!

اور جس وقت پانچ بچوں والے میاں بیوی سٹیشن پر اترے تو ڈنڈوں سے چمٹ چمٹ کر اور پائدانوں پر کانپ کانپ کر ——— ادھر ایک ننھا بغل سے کھسک گیا۔ ادھر دوسرا بلبلا اٹھا۔ ادھر ایک گٹھڑی لٹک گئی ——— ادھر "ٹن ٹن" بجتی لٹھ پلیٹ فارم پر جاگری ——— پیسے کی پکوڑیاں خریدی گئیں ——— پیسے کے لال بیر اور پیسے کی بھونی ہوئی مونگ پھلی ——— اور یہ پھٹے ہوئے چیتھڑوں میں لپٹے ہوئے ہندوستان جنت نشان کے آئندہ دور کے پنکھا قلی تھرڈ کلاس کے دروازے سے گزرتے ہوئے مسافروں کے سیلاب میں بہہ گئے!

بہت دیر تک میں مبہوت بیٹھا رہا۔ بچوں سے لوگ اس درجہ محبت کیوں کرتے ہیں۔ یہ کیا بات ہے کہ کالے چہروں' موٹی آنکھوں اور بھونڈے اعضا والے لڑکوں کو مائیں اسی ازلی محبت سے چومتی ہیں جس طرح ایک پھول ایسے شگفتہ بچے کو ——— اور پھر یہ کیا راز ہے کہ جاپانی کلپ والی بھینگی عورت اپنے جوبن کا اشتہار دینے کے علاوہ بچے کو چھاتی سے بھینچے ہوئے ہے اور یہ بوڑھا جو ایک بار پھر بوری کا ٹکڑا جلا کر سارے ڈبے کو دھواں دار کیے ہوئے ہے اور یہ بڑھیا جس کے پوپلے منہ میں اس کی زبان ربڑ کی گیند کی طرح لرز رہی ہے۔ یہ سب کدھر جا رہے ہیں؟ آخر اس بڑھیا کو ایسا کون سا ضروری کام پڑ گیا کہ لکڑی کے تختے پر لیٹی ہر سٹیشن کو کالا شاہ کاکو سمجھ کر اترنے کے لیے تیار

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہو جاتی ہے۔ اور جب اسے بتایا جاتا ہے کہ وہ سٹیشن تو ابھی بہت دور ہے تو آہ کھینچ کر بیٹھ جاتی ہے۔ اور کہتی ہے۔ ''نوج یہ کیسی ماری گاڑی ہے!''

میں نے ایک بار بڑھیا سے پوچھ لیا۔ ''تجھے کیا کام ہے کالا شاہ کاکو میں؟''

بولی۔ ''اُدھر میری بیٹی رہتی ہے۔ میں سہارن پور کی رہنے والی ہوں ——— پنجاب کا ایک مزدور وہاں کارخانے میں کام کرتا ہے' اس کے ساتھ بیٹی بیاہ دی۔ بیچاری چودہ سال بے اولاد پڑی روتی رہی۔ پرسوں اس کی چٹھی آئی ہے کہ اس کے ایک ننھا ہوا ہے۔ اس لیے ادھر پنجاب میں اس عمر میں بھٹک رہی ہوں۔ یہ اس کے لیے کپڑے لیے جا رہی ہوں ولایتی ریشم کے!''

اور میں نے بڑھیا کی تسلی کے لیے اس کی گٹھڑی ٹٹول کر اس بوڑھے حقہ نوش سے پوچھا۔ ''آپ کہاں جائیں گے بابا جی؟''

''لاہور!'' بلغم بوڑھے کے حلق میں کھڑکھڑانے لگا۔

''کون رہتا ہے وہاں آپ کا؟''

''بیٹا ——— اس کے ہاں پرسوں ایک لڑکا ہوا ہے!''

گنڈیریوں کے چھلکوں پر مکھیاں بھنبھنا کر بیٹھ گئیں!

لاہور سٹیشن کی گہما گہمی اور باہر سڑکوں کی ہماہمی میں ان تھرڈ کلاس خیالات سے پیچھا چھڑا کر میں گھر آیا تو دروازے پر مجھے ایک بڑھیا ملی اور ملتے ہی پکاری ''تو آگیا میرے بچے' مبارک ہو تجھے' تیرے گھر کل شام ایک لال پیدا ہوا ہے!''

''کالے رنگ کا لال۔'' اندر سے ایک شریر لڑکی پکاری۔ میں شرما گیا۔ محلے والیاں جمع تھیں۔ بڑھیا نے جب مجھے یہ بتایا کہ ننھا کچھ بیمار ہے تو میں نے وہیں سے احکام صادر کرنا شروع کر دیئے ——— بیگم کو روشندان والے کمرے میں رکھا جائے اور میں مس ایولپ لیڈی ڈاکٹر کو بلائے لاتا ہوں ———

www.iqbalkalmati.blogspot.com

نیز بچے کو گرم کپڑوں میں لپیٹا جائے۔ بیگم بہت باتیں نہ کریں۔

اور شام کو جب محلے والیاں چلی گئیں تو میں نے اپنی سوئی ہوئی بیگم کے پہلو میں ننھے کو دیکھا' کالا رنگ ـــــ موٹی ناک ـــــ بھونڈے اعضاء ـــــ وہ نیند میں اچانک چونک کر رونے لگا اور میں سمجھا وہ ہمک کر گاڑی کے نیچے گر گیا ہے!

"کیا ہے؟" بیگم نے نحیف آنکھیں کھولتے ہوئے پوچھا۔

میں نے بغل سے ایک پوٹلی نکال کر کھولی اور قیمتی کشمیرے کا دو گز کپڑا ننھے کے اردگرد لپیٹتے ہوئے بولا۔ "یوں ـــــ سردی نہ لگ جائے ننھے میاں کو!"

بیگم کے گالوں پر گلابیاں بکھر گئیں۔ باہر سے آواز آئی ـــــ "بے روزگار ہوں غریب ہوں۔ ننھے ننھے بچے ہیں۔ ننگے ہیں۔ بھوکوں مر رہے ہیں۔ کوئی خدا ترس ـــــ!"

میرے سامنے جیسے گنڈیریوں کے چھلکے بکھر گئے اور دماغ میں خطرے کی زنجیر حرکت کرنے لگی۔

* * *

www.iqbalkalmati.blogspot.com

میرا رانجھا

سرکنڈے کے چھپر تلے ایک عورت بیٹھی تھی اور کچھ دور تالاب کے سبز پانی میں ایک دوشیزہ گاگر گھما رہی تھی۔ دوپہر کا وقت تھا۔ حدِ نظر تک میدان لرز رہا تھا۔ جوہڑ کے کنارے بیری کا ایک ٹنڈ منڈ درخت دھوپ میں اکڑ گیا تھا۔ گاؤں کے جو پندرہ بیس گھر تھے' ان پر قبرستان کی سی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ چھپر اور تالاب کے وسط میں ایک بیمار کتیا دم لٹکائے ایک جھاڑی کی طرف رینگتی جا رہی تھی۔

اچانک عورت کھنکارتے ہوئے زور سے پکاری "ہے امامی' اری وہیں جا کر مر گئی۔ تجھے گاگر گھمانے میں بڑا مزا آتا ہے! ایک ڈبکی دے اسے اور لپک کر ادھر آ۔ میرے پاؤں ٹوٹ رہے ہیں۔"

بیٹھے بیٹھے پاؤں ٹوٹ رہے ہیں! امامی کی آنکھیں جو آسمان کی طرح نیلی اور سیپی کی طرح صاف تھیں' جھپک گئیں۔ کیا بہانہ ہے! پاؤں ٹوٹ رہے ہیں۔ وہ یہ سوچ رہی تھی کہ ایک اور آواز آئی۔ "اری سن رہی ہے تو کہ مجھے ادھر آنا پڑے گا۔ پھلپائی؟ تو تو اب من مانی کرنے لگی۔ آنے دے اپنے چچا کو۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

حرامزادی کی چوٹی نہ کٹوادی تو۔"

امامی نے گاگر سر پر دھرلی۔ پانی دو ایک بار چھلکا اور اس کے شانوں اور سینے پر آگرا۔ اس کا لباس جسم سے چپک گیا۔ لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے چھپر تک پہنچی۔ گاگر کی گردن میں ہاتھ ڈال کر اتارنے کے لیے جھٹکا جو دیا تو دھڑاک کی آواز آئی۔ گاگر کی گردن امامی کی انگلیوں میں تھی اور دھڑ ٹکڑے ٹکڑے ہو کر زمین پر بکھرا پڑا تھا۔ پانی ایک ندی کی صورت میں دور تک بہتا چلا گیا۔

عورت کھاٹ سے اچھل کر امامی کے پاس آئی اور بغیر سوچے سمجھے چار پانچ دوہتڑ جما دیئے۔ امامی کے گال لال پڑ گئے۔ آنکھوں میں پانی آگیا۔ ہونٹوں کو تھرتھری چھوٹ گئی۔ بت بن کر رہ گئی اور اس کی باتیں سنتی رہی۔

"ڈائن' تیری نخروں کی کوئی حد بھی ہے؟ پرسوں پیالہ توڑ ڈالا۔ کل اپنے چچا کا حقہ تازہ کرتے کرتے اسے اوندھا دے مارا۔ آج گھڑے کو موت کے گھاٹ اتار کر ٹک ٹک مجھے گھور رہی ہے۔ جیسے میں نے ہی تو کہا تھا کہ اسے زمین پر دے مار۔ بدذات' تو تو میری گردن پر سوار ہوئی جا رہی ہے!"

امامی گاگر کے ٹکڑے اٹھا کر چھپر سے دور جھاڑی میں پھینک آئی۔ بیمار کتیا چیخ کر جھاڑی سے اٹھی اور تالاب کے پانی میں گھس گئی۔ امامی کے آنسو آگئے۔

واپس آئی اور چچی کی پائنتی پر بیٹھ کر اس کے پاؤں دابنے لگی۔ روتی رہی اور اس کے آنسو اس کے رخسار پر ڈھلک کر اس کی جھولی میں گرتے رہے۔ موٹے کھدر کی میلی چیکٹ قمیض بھیگ گئی۔ آنکھوں کے ڈوروں میں آگ سی جلنے لگی۔ کنپٹیوں میں جیسے کوئی چاقو چبھو رہا ہے۔ وہ چاہتی تھی' زور زور سے روئے اور دنیا کو بتائے کہ بچپن سے یہاں عذاب جھیل رہی ہوں مجھے کھانے کے لیے جو کی روٹی ملتی ہے۔ اور پینے کے لیے اس غلیظ جوہڑ کا پانی۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ایک ایک گھونٹ میں دس دس ٹکڑے ـــــــ میرے لیے اب تک میرے چچا جی کو ایک ٹوٹی کھاٹ کے سوا کچھ میسر نہیں آیا۔ میں کون ہوں' میں یہاں کیسے آئی؟ میرے ماں باپ کون ہیں۔ میں پیدا ہوتے ہی اس دنیا میں اجنبی بن کر کیوں رہ گئی!"

اس کے دل سے یہ آوازیں روزانہ اٹھتی تھیں۔ اور اس کی رگ رگ میں آگ بھڑکا کر پھر دل کی گہرائیوں میں سو جاتی تھیں' جیسے کھلے سمندروں میں طوفان آتے ہیں' تھوں سے موجوں کو اوپر اچھال کر چلے جاتے ہیں اور موجیں پھر نیچے جا کر سو رہتی ہیں!

اس کا چچا اس پر مہربان تھا مگر اس کی مہربانی صرف اس حد تک تھی کہ وہ اسے جھڑکتا نہ تھا۔ کبھی کبھی سر پر ہاتھ پھیر دیتا تھا گاہے گاہے' "بیٹی" کہہ کر پکار لیتا۔ وقتاً فوقتاً بیوی کو یہ بھی کہہ دیا کرتا کہ اسے گیہوں کی روٹی پکا دیا کرے۔ اس لیے اماں کو اس سے انس تھا۔ اور جب وہ آتا تھا تو وہ سمجھتی تھی کہ یک بیک اس کے سر پر سے کسی نے ایک بھاری چٹان اٹھا کر پرے دھر دی ہے!

لیکن پھر بھی وہ اس آباد گھر میں ایک اجنبی کی حیثیت رکھتی تھی۔ چچی کے پاؤں پنڈلیاں دباتے دباتے اس کی انگلیوں میں ورم آجاتا۔ اور جب اس کی گرفت کچھ ڈھیلی پڑنے لگتی تو چچی کا بھاری ہاتھ اس زور سے اس کے تالوں پر پڑتا کہ وہ سمجھتی اس کا سر دو ٹکڑے ہو کر رہ گیا ہے!

کئی بار وہ اونچی چٹانوں سے نیچے کود پڑنے کو تیار ہو جاتی۔ کئی بار خوفناک تالابوں میں ڈوب مرنے کو دوڑتی۔ لیکن اسے جو چٹان ملتی وہ پست ہوتی اور جو تالاب ملتا وہ پایاب ہوتا۔ پھر وہ مرنے سے کچھ نہ کچھ ڈرتی بھی ضرور تھی۔ اس نے اپنی ایک سہیلی کو دم توڑتے دیکھا تھا اور وہ سوچا کرتی تھی کہ مرنا ضرور کوئی تکلیف دہ مرحلہ ہے۔ کیونکہ اس کی سہیلی موسم سرما میں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

نرم و گرم بستر پر لیٹے ہوئے بھی پسینے سے شرابور ہوتی جا رہی تھی۔

اس کے دل کی خلوتوں سے راتوں کو ایک دبا دبا نغمہ بلند ہوتا—— ایک دکھی دکھی نغمہ—— کاش میرا بھی کوئی غمگسار ہوتا! کاش مجھے بھی کوئی تسلیاں دے سکتا! کاش میں بھی کسی کو اپنا کہہ کر پکار سکتی! ہم دن کو اکٹھے ویران گھاٹیوں میں آوارہ پھرتے رہتے' راتوں کو ہم اکٹھے آسمان پر نگاہیں گاڑ کر تارے گنتے گنتے سو جاتے—— ایک سہیلی تھی۔ وہ بھی چل بسی! اب میرا اس دنیا میں کون ہے!

امامی کو اپنے متعلق یہ بہت بڑی غلط فہمی تھی کہ اس دنیا میں اس کا کوئی نہیں تھا۔ گاؤں کے سارے خوش رو نوجوان اس کی محبت کا دم بھرتے تھے۔ اور ایک نوجوان دوست محمد کے متعلق تو یہ بھی مشہور ہو گیا تھا کہ وہ "ہیر" گاتے گاتے ہیر کی جگہ امامی کا نام لگا دیتا ہے اور رانجھے کی جگہ اپنا۔ چوپال والے اسے اس پر جھڑکتے ہیں اور وہ کہتا ہے کہ سچی بات کو چھپانا اس کی فطرت میں نہیں!

امامی نے بھی اڑتی سی خبر سنی کہ دوست محمد نے رات کو ہیر کی جگہ امامی کا نام لیا تھا۔

اور اگر چچا جی سن پائیں!

مگر امامی کے گرد و غبار سے اٹے ہوئے دل نے یک بیک ایک پھریری لی۔ اسے زندگی میں پہلی بار محسوس ہوا کہ اس کے سینے میں ایک دل ہے اور وہ دھڑکتا بھی ہے۔ وہ جب غلیظ جوہڑ سے پانی بھرنے گئی تو بہت دیر تک سبز پانی میں اپنا عکس دیکھنے کی کوشش کرتی رہی اور گاگر اٹھاتے ہوئے بڑے شرمیلے' مدھم مگر میٹھے انداز میں بولی "میرا رانجھا!"

اسے محسوس ہوا جیسے بیری کے خشک پتوں پر کسی نے ہولے سے قدم رکھا ہے! کوئی اس کی طرف آ رہا ہے! اس چلچلاتی دھوپ میں کسی کا اس گندے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بدبودار جوہڑ پر کیا کام! اس نے خوفزدہ ہرنی کی طرح ادھر ادھر دیکھا۔ گاگر نے چھلک کر اس کا منہ بھگو دیا۔ ایک طرف سے دوست محمد ڈرتے ڈرتے قدم اٹھاتا اس کی طرف آرہا تھا۔ وہ پلٹ کر تیز تیز قدم اٹھانے لگی۔

"امامی"

"کون ہو تم؟" اس نے مڑے بغیر پوچھا۔

"تمہارا رانجھا!"

امامی وحشت زدہ ہو کر بھاگنے لگی۔ گاگر چھلک کر آدھی رہ گئی۔ کپڑے بھیگ گئے۔ بھیگا ہوا آنچل گھسٹتے گھسٹتے مٹی میں لت پت ہو گیا۔ چھپر تلے پہنچی۔ گھڑا ایک طرف رکھ دیا۔ مڑ کر دیکھنے کی جرات نہ ہوئی۔ چچی پرلی طرف مکان کے سامنے بیٹھ کر کریلے کاٹ رہی تھی' پکاری "کیا جوہڑ میں کپڑوں سمیت نہاتی رہی ہے کلموہی؟ یہ رنگ تو اچھے نہیں۔ نوج تو توکل کلاں یہاں سے بھاگ کھڑی ہوگی۔"

لیکن امامی کی سانسیں الجھی ہوئی تھیں اور رنگ اڑا ہوا تھا۔ اس نے بہت دیر کے بعد تالاب کی طرف دیکھا۔ بیری کا ٹنڈ منڈ درخت تالاب میں اپنے کبڑے جسم کا عکس دیکھ رہا تھا اور اس کے آخری ٹنڈ پر ایک کوا بیٹھا زور زور سے کائیں کائیں کر رہا تھا۔

"میرا رانجھا" امامی نے گاگر کو ایک جگہ جماتے ہوئے اپنے آپ سے سرگوشی کی۔

اسے اکثر راتوں کو نیند نہیں آتی تھی مگر اس رات کی بیداری میں ایک کیف تھا جو اسے بری طرح مخمور کیے ڈالتا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ یونہی جاگتی رہے' ابد تک جاگتی رہے' اس کے پپوٹے یونہی بھاری رہیں' اس کا سینہ یونہی جلتا رہے' اور اس کا رانجھا........ وہ آگے کچھ نہ سوچ سکی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ آگے کیا سوچے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

غلیظ جوہڑ سے وہ اپنے پینے کے لیے پانی بھرنے جاتی تھی ورنہ چچا کے لیے تو چشمے میں سے پانی آجاتا تھا۔ وہ خود بھی چشمے پر چلی جاتی مگر گھر کے کام کاج میں حرج ہوتا تھا اور چچی کی گالیاں اتنی سخت تھیں کہ ایک بار مسجد کے مولوی جی نے سن کر کانوں میں انگلیاں ٹھونس لی تھیں۔

دوسرے دن وہ پھر اسی وقت جوہڑ پر گئی۔ ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ جھاڑیوں کے آس پاس آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتی رہی۔ اسے کچھ نظر نہ آیا۔

"میرا رانجھا" اس نے قدرے بلند آواز میں کہا۔ اسے ایک انگڑائی آگئی۔ بازو پورے زور سے تانے اور سر پیچھے پھینکتے ہوئے پکاری "اف!"

وہ سمجھی کہ کوئی اس کے قریب کھڑا ہے۔ "امامی" کسی نے اس کے کان میں سرگوشی کی "میری ہیر۔"

"میرا رانجھا۔" اس نے ایک اور انگڑائی لی اور گاگر بھرنے کے لیے پنڈلیوں تک کپڑا اٹھا کر جوہڑ میں گھس گئی۔ گھم گھم گھم —— گاگر بھر گئی! اس نے ایک بار پھر دیکھا۔ چھم چھم چھم۔ اس کا جی بھر آیا۔ گاگر سر پر رکھی اور چھپر کی طرف جانے لگی۔

"امامی" کوئی بیری کے تنے کی اوٹ سے بولا۔

"کون؟" اس نے پلٹ کر پوچھا۔

دوست محمد درخت تلے کھڑا تھا۔ "تمہارا رانجھا۔"

آج وہ ہولے ہولے قدم اٹھاتی چھپر تلے آگئی۔ وہاں پہنچ کر گھڑا رکھتے ہوئے اُدھر دیکھا۔ دوست محمد اسی حالت میں کھڑا تھا۔ امامی کو جیسے کسی نے ہوا میں اچھال دیا ہے۔ چکرا سی گئی۔ اچانک چچی کی آواز آئی۔ "اری کھڑی کس کو تاک رہی ہے؟ وہ چھوکرا کون ہے؟ جوہڑ پر اسی سے اشارے ہو رہے تھے نا؟ بدذات' کمینی۔ اسی لیے جوہڑ پر سارا دن گزار دیتی ہے تو؟ دن دہاڑے گھر کے سامنے یہ لچھن؟ کیا تو نے مجھے اندھا سمجھ رکھا ہے؟ اری ڈائن۔

کنواری لڑکی جوان چھوکروں سے یوں تالاب میں کشتیاں کھیلے! زمانہ الٹ گیا۔ آنکھوں میں حیا نہ رہی۔ کیا اندھیر نگری ہے کہ میرے سامنے ہی اپنے عاشق میاں سے اشارے ہو رہے ہیں۔ تجھے ہیضہ آئے۔ تو نے میرے مالک کی ناک کاٹ کر رکھ دی۔ تجھے قہر بلائے تو نے یہ کیا کیا؟"

امامی کو اب محسوس ہوا کہ دوست محمد کا یوں دن کے وقت جوہڑ پر آکر اسے چھیڑنا اور پھر خود اس کا چھپر تلے کھڑے ہو کر اسے گھورنا پرلے درجے کی نادانی اور عاقبت نااندیشی ہے! گاؤں والیاں دوڑی آئیں۔ چچی کی آواز میں ایک جادو تھا کہ سب کھنچی چلی آئیں۔ "کیا ہوا؟ کیا بات ہے؟" سوالات کا تانتا بندھ گیا۔ سب امامی کو جھکی بھوؤں اور چبھتی نگاہوں سے گھورنے لگیں۔

ایک بڑھیا چارپائی پر کھڑے ہو کر دونوں ہاتھوں سے اشارہ کرتے ہوئے بولی "ارے ذرا ایک پل تو چپ ہو جاؤ۔ تمہاری زبانیں ہیں کہ قینچیاں۔ کوؤں کی طرح کائیں کائیں کیے جا رہی ہو۔ کچھ کہنے سننے بھی دو۔ لو چپ ہو جاؤ ایک پل کے لیے!"

خاموشی چھا گئی۔ امامی چھپر میں ایک بے جان ستون کی طرح دم بخود کھڑی تھی۔ کسی احساس نے اس کے قدموں میں بیڑیاں ڈال دی تھیں اور دل میں بجلیاں بھر دی تھیں۔ ان کی آنکھیں جھپکتے جھپکتے رک گئیں۔ اس کا دل دھڑکتے دھڑکتے ٹھہر گیا۔ "یہ کیا ہو رہا ہے! اب کیا ہو گا! یہ کیا ہوا!"

بڑھیا نے چچی سے پوچھا۔ "لے اب بتا بہو رانی' کیا بات ہے؟"

چچی اب رو رہی تھی۔ سسکیوں اور ہچکیوں کے ہجوم میں تھرتھراتی ہوئی آواز میں بولی۔ "کیا بتاؤں۔ ہم جیتے جی مر گئے۔ خاندان کی لاج مٹی میں مل گئی۔ آبرو کی جڑ کٹ گئی۔ میں نے کہا تھا کہ تمہارے بیٹے سے کہ ناگن کو پالنا دانائی نہیں۔ مولا جانے کہاں سے اٹھا لایا اور بیٹی بنا کر پالنے لگا۔ اب پتہ چلے گا کہ تماں چاہے انگوروں میں بڑھے پر ہو گا کڑوا۔ میرے سامنے کھڑی جوہڑ

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

پر کسی آوارہ چھوکرے سے اشارے کر رہی تھی۔ میری آواز سن کر وہ تو کھسک گیا اور خود چھپر تلے کھڑی مجھے یوں گھور رہی ہے جیسے بس چلے تو چبا ہی ڈالے گی۔ پرسوں سے آدھی آدھی رات کو میں اس کا بستر بھی خالی دیکھ رہی ہوں۔"

سرگوشیاں شروع ہوگئیں۔ امامی کو یہ سرگوشیاں بے شمار سانپوں کی پھنکاریں معلوم ہونے لگی جو اسے کاٹ کھانے کے لیے اس کے آس پاس لمبی لمبی دودھاری زبانیں نکالے جھوم رہے تھے! آناً" فاناً" یہ خبر سارے گاؤں میں پھیل گئی کہ امامی اپنے عاشق سے اشارے کر رہی تھی کہ چچی نے آلیا۔ اور اب بھیگی بلی بنی چھپر تلے بیٹھی ناخن سے مٹی کرید رہی ہے!

نوجوانوں میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں کہ وہ کون تھا جس نے جوہڑ پر جا کر دن دہاڑے اس مغرور چھوکری سے بات کرنے کی جرأت کی۔ اس کی آنکھوں میں تو بجلی کی چمک ہے! یوں معلوم ہوتا ہے جیسے کسی کو آنکھ بھر کر دیکھے تو بھسم کر ڈالے!

"دوست محمد ہوگا دوست محمد۔" ایک گبرو بولا۔ "کل ہیر کی جگہ امامی پڑھ رہا تھا۔"

"ارے چھوڑو بھی۔ اس میں اتنا بل کہاں! کوئی اور من چلا ہوگا۔"

دوست محمد بھی اس مجمع میں موجود تھا۔ بولا۔ "کوئی منچلا ہوگا۔"

اس کا من پھیلنے لگا اور ایک ہی پل میں وہ ساری کائنات پر محیط ہوگیا ——— ساری کائنات پر ——— جس میں دوست محمد اور امامی کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ وہ مبہوت سا ہوگیا' جیسے کھڑے کھڑے سو گیا ہے۔ ایک دوست نے اسے جھنجھوڑا۔

"کیا سوچ رہے ہو؟"

"ارے وہ منچلا مجھے ملے تو اسے گلے سے لگا لوں۔"

www.iqbalkalmati.blogspot.com

سب گبرو ہنسنے لگے! دوست محمد جی ہی جی میں ان گبروؤں پر ہنسنے لگا۔

اب جوہڑ پر کون ملے۔ چچی کھاٹ سامنے ڈال کر بیٹھ جاتی اور امامی گھڑا پانی میں ڈال کر سر پر رکھتی اور جھپاک سے چھپر تلے پہنچ جاتی۔ اس کے چچا نے بھی اسے بہت مدت کے بعد سخت سست کہا تھا۔ اس لیے اب بھلائی اسی میں تھی کہ من کی آگ دبا کر بیٹھ جائے اور جو پڑے وہ جھیلے! امامی کی حالت اس پھول کی سی ہو گئی جو اپنے ہی بوجھ سے ایک طرف جھک گیا ہو۔ کونپل ٹوٹ گئی ہو اور اب پھول آہستہ آہستہ مرجھا رہا ہو!

ایک رات وہ کھاٹ پر پڑی تھی۔ گہرے سیاہ آسمان پر ٹکے ہوئے ننھے ننھے ستارے پسینے کے ان قطروں کی طرح مضطرب نظر آ رہے تھے' جو کسی پیاسے انسان کے ماتھے پر آہستہ آہستہ ابھر رہے ہوں! دور جوہڑ کے کنارے بیری کا درخت اپنے بازو آسمان کی طرف اٹھاتے کسی بیمار ملزم کی طرح خاموش کھڑا تھا۔

نہ جانے اسے کیا خیال آیا۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ چچی گہری نیند سو رہی تھی۔ چچا کہیں باہر گئے ہوئے تھے۔ وہ کھسکتی ہوئی چھپر تلے آ گئی۔ اسے بیری کے درخت سے ڈر سا محسوس ہونے لگا' جو سیاہ آسمان کے بالمقابل سیاہ بازو پھیلائے جیسے اس کا کلیجہ نوچ لینے کا منتظر کھڑا تھا۔ لیکن وہ لڑکھڑاتے اور رکے قدموں سے آگے بڑھتی گئی —— آہستہ آہستہ —— ہولے ہولے —— جیسے اس کے پاؤں تلے کانچ بچھا ہوا ہے' اور اسے اس کے ٹوٹ جانے کا خطرہ دامن گیر ہے۔ جوہڑ کے کنارے پہنچی تو کالے پانی میں ستاروں کے دھندلے دھندلے عکس دیکھ کر وہ گھبرا سی گئی۔ اسے یوں محسوس ہونے لگا جیسے وہ نیچے آسمان کی طرف گر جائے گی۔ نیچے اوپر آسمان اور جیسے وہ بیچ میں کسی نامعلوم قوت کی وجہ سے معلق کھڑی ہے۔ وہ گھبرا کر وہیں بدبودار کیچڑ پر بیٹھ گئی! —— اور خوفزدہ ہو کر آنکھیں بند کر لیں!

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بیری کے درخت کے تلے کسی نے خشک پتوں پر دھیرے سے قدم دھرا!

بھوت!

اس کا دل دھک دھک کرنے لگا۔

دوسرا قدم!

تیسرا!

چوتھا!

امامی کو جیسے کسی نے آہنی شکنجے میں جکڑ لیا ہو!

وہ گھبرا گئی۔ زبان تالو سے لگ گئی۔

قدم مڑ گئے اور بیری کے تنے کا چکر کاٹ کر پھر اسی طرح آہستہ آہستہ خشک پتوں پر پڑنے لگے۔

اس کی سانسیں بگولے بن گئیں!

یکایک سرگوشی کی سی آواز آئی۔ "میری ہیر۔"

"میرا رانجھا۔" امامی نے زیر لب یہ الفاظ دہرائے۔ گردن اٹھا کر اس طرف دیکھا——ایک سایہ بیری کے تنے کے اردگرد طواف کر رہا تھا۔

"کون ہو تم؟" گھبرائی ہوئی آواز میں بولی۔

"انسان!"

سایہ اس کے قریب آ گیا اور اس پر جھک گیا۔ "تم کون ہو؟"

"امامی"

"میری ہیر۔"

نیچے جوہڑ کے کالے پانی اور اوپر آسمان کے سیاہ سینے پر ستارے ناچنے لگے۔ بیری کا درخت اپنے بازو پھیلانے لگا۔ تالاب کے کنارے خشک کائی میں کسی جھینگر نے نیند میں نغمہ چھیڑا اور چپ ہو گیا۔ گاؤں میں دو چار کتے ایک

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ساتھ بھونکے اور پھر اچانک خاموش ہو گئے۔ کائنات نے ایک کروٹ بدلی! امامی اٹھ کھڑی ہوئی۔ "تم کون ہو؟"

"تمہارا رانجھا۔"

"اس دن تم مجھے گھورتے رہے۔"

"ہاں۔"

"بڑی بدنامی ہوئی۔"

"میں نے بھی سنا تھا۔"

"تم یہاں کیوں آئے؟"

"روز آتا ہوں۔"

"روز آتے ہو؟"

"ہاں روز آتا ہوں۔"

"کیوں؟"

"تمہارے لیے۔"

"میں تو چھپر کے اُس پار سو رہی ہوتی ہوں۔"

"میں چھپر کے اِس پار جاگ رہا ہوتا ہوں۔"

"کیوں؟"

"تمہارے لیے۔"

"کیا مطلب؟"

"کیا بتاؤں۔"

"تم میرا پیچھا چھوڑ دو۔"

"کیوں؟"

"یہ اچھی بات نہیں ہوتی۔"

"لیکن بدنامی تو ہو چکی۔"

www.iqbalkalmati.blogspot.com

خاموشی چھا گئی۔ دونوں کی سانسوں کی آواز ایک دوسرے کو سنائی دینے لگی۔ دونوں سر جھکائے کیچڑ میں انگلیاں پھیرنے لگے!

"اچھا میں اب جاتی ہوں۔"

"پھر کب ملو گی؟"

"کل!"

"یہیں؟"

"یہیں۔"

"اچھا!"

"اچھا۔"

وہ یہاں سے تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی چھپر تلے آ گئی۔ مڑ کر دیکھا۔ اندھیرا وسیع میدان میں سنسنا رہا تھا! کیا یہ خواب تھا یا بیداری۔ اس نے اپنے بازو پر زور سے چٹکی لی! وہ جاگ رہی تھی۔ "میرا رانجھا۔" اس نے اتنی گہری سانس لی کہ اس کا سینہ بہت دیر تک ابھرتا ہی چلا گیا! اس کی چچی ابھی تک سو رہی تھی۔ وہ اپنی کھاٹ پر پڑ رہی اور صبح تک یونہی پڑی رہی! آج اسے بخار سا ہو رہا تھا!

"مجھے آج بخار ہو رہا ہے۔ میں کوئی کام نہیں کر سکوں گی۔" وہ صبح کو انگڑائی لے کر تھکی تھکی آواز میں بولی۔

"تجھے بخار لے جائے۔ تو اب میرے کام کی نہیں رہی۔" چچی نے ناک چڑھاتے ہوئے جواب دیا۔

وہ تمام دن دیوار سے لگی بیٹھی رہی۔ پڑوسنیں آئیں اور چچی سے پوچھنے لگیں۔

"امامی کو کیا ہو گیا ہے؟"

"سانپ سونگھ گیا۔"

www.iqbalkalmati.blogspot.com

امامی جی ہی جی میں چچی پر مسکرا دی!

چچا آئے۔ "کیا ہوا امامی؟"

"کچھ نہیں۔"

چچی بولی۔ "صبح سے بخار کا بہانہ لے کر بیٹھی ہے۔ سچ کہوں' اس کے ہوتے میں جی نہ سکوں گی۔"

چچا نے امامی کی نبض دیکھی۔ "افوہ۔ بڑا گرم ہے اس کا جسم۔ اری پڑوسن سے چائے کی چٹکی تو مانگ لا۔ امامی کو تو بہت سخت بخار ہو رہا ہے!"

امامی جی ہی جی میں چچا پر مسکرا دی!

رات ہو گئی۔ چچا پھر کسی کام پر چلے گئے اور چچی کو تاکید کر گئے کہ امامی کی دیکھ بھال کرے۔ کہیں وہ بخار کی شدت سے رات کو بیہوش نہ ہو جائے۔ موقع پا کر امامی کھاٹ سے کھسک کر جوہڑ کی طرف چل دی! اور ادھر بیری کے تنے کے پاس سے ایک سایہ کھسکا اور اس کی طرف آیا۔

"امامی۔"

"دوست محمد۔"

"میری ہیر۔"

"میرا رانجھا۔"

امامی نے بہت مشکل سے یہ الفاظ ادا کیے —— بہت مشکل سے —— اور بہت آہستہ آہستہ! لیکن وہ سمجھی' اس نے اپنے دل کا سارا بوجھ اتار کر جوہڑ کے غلیظ پانی میں پھینک دیا ہے! اور جیسے اب اس کے پر لگ گئے ہیں اور وہ اڑ کر اس ٹنڈ منڈ بیری کی آخری پھننگ پر بیٹھ کر اپنے رانجھا کے ہمراہ ہیر وارث شاہ گا رہی ہے!

"میں بہت دیر سے تمہارا منتظر کھڑا تھا۔"

"میں سمجھی تم ابھی تک نہ آئے ہو گے۔"

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"میں شام سے یہیں بیٹھا ہوں۔"

"اوہو!"

"میں نے تمہیں ایک بار کھاٹ پر بیٹھے دیکھا تھا۔"

"اچھا!"

جوہڑ کے کنارے جھینگر چیخ کر چپ ہو گیا۔ اور دور گاؤں میں کتے ایک ساتھ بھونکے اور خاموش ہو گئے!

"امامی" دوست محمد نے رازدارانہ لہجے میں میں کہا۔ "امامی۔ تم نے کبھی یہ بھی سوچا ہے کہ میں یہاں کیوں آتا ہوں؟"

امامی خاموش رہی۔

"امامی، میں اس لیے آتا ہوں کہ تم سے وعدہ لوں کہ تم میرے علاوہ اور کسی کی نہ بنو گی۔"

امامی رو دی، بولی۔ "میں چچا چچی کے بس میں ہوں دوست محمد۔"

"یہ زنجیریں ٹوٹ بھی سکتی ہیں۔"

"نہ بھی ٹوٹیں تو بھی میں تمہاری ہوں۔"

"امامی۔"

دونوں کے دماغوں میں گونج سی پیدا ہوئی، جیسے وہ کسی برق رفتار گھوڑے پر سوار پہاڑوں کی چوٹیاں اور سبز گھاٹیاں اور گھنے جنگل الانگتے پھلانگتے کہیں اڑے جا رہے ہوں۔

اس کے بعد ایک روز دوست محمد شہر کے سفید پوشوں کو اکٹھا کر کے امامی کے چچا کے ہاں لے آیا اور امامی کے رشتے کا طالب ہوا۔ وہ بھی شاید امامی سے دامن چھڑانے کا منتظر بیٹھا۔ پکار اٹھا۔ "دینے کا مال ہے۔ انکار کیا کروں۔" اتنا سستا سودا!

امامی نے بھی یہ خبر سنی۔ خوش ضرور ہوئی۔ لیکن دوست محمد کو رانجھا اور

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اپنے آپ کو ہیر کہنے سے ہچکچانے لگی۔ انہوں نے مصیبتیں جھیلیں۔ ہم نے صرف دو چار راتیں آنکھوں میں کاٹیں۔ وہ مرتے مرگئے لیکن جی بھر کر ایک دوسرے سے نہ مل سکے۔ ہماری کل کلاں شادی ہو جائے گی۔ نہ میں ہیر بن سکتی ہوں' نہ وہ رانجھا۔ دوست محمد اگر پہلے دن ہی میرا رشتہ پوچھ لیتا تو یہ دو چار دن کی الجھنیں بھی نہ دیکھنا پڑتیں۔

شادی سے ایک دن قبل شام کو کھانا کھا کر امامی دیوار سے لگی بیٹھی تھی کہ چھپر میں اسے دوست محمد کی آواز سنائی دی۔ وہ کھسکتی کھاٹ کی اوٹ میں چھپر کے قریب ہوگئی۔ چچی کہیں پڑوس میں چلی گئی تھی۔ اس کا چچا دوست محمد سے باتیں کر رہا تھا۔

"بیٹا دوست محمد۔ امامی کو تمہارے ہاتھ سونپ دینے سے پہلے میں مناسب سمجھتا ہوں کہ تمہیں ایک راز بتا دوں۔ مبادا بعد میں تمہیں یہ بات معلوم ہو اور تم وہ کر بیٹھو جو تمہیں نہیں کرنا چاہیے۔ میں اپنی آخرت خراب نہیں کرنا چاہتا اس لیے تمہیں دھوکا نہیں دوں گا۔ تم جانتے ہو' امامی میری بیٹی نہیں۔ لیکن تمہیں یہ خبر نہیں کہ میں نے اسے کہاں سے حاصل کیا۔ مدتیں گزریں میں بھی تمہاری طرح جوان تھا۔ مجھے ایک لڑکی سے محبت ہوگئی۔ بہت عرصے تک ہم ایک دوسرے کی محبت کا دم بھرتے رہے۔ اور آخر ایک روز میں یہ سنکر بھونچکا سا رہ گیا کہ وہ ماں بننے والی ہے——اور باپ——وہ میں ہی کمبخت تھا!

"دوست محمد: تم ابھی ناتجربہ کار ہو' تم نہیں جانتے کہ میرے دل پر کیا گزری۔ مجھے اس لڑکی سے محبت تھی۔ اور اب عام دنیا کی طرح میں اسے یوں اجاڑ راہ میں چھوڑ کر اکیلا آگے نہیں بڑھ سکتا تھا۔ میں نے اسے ایک جوہڑ کی اس بیری تلے یقین دلایا کہ میں اس کا ہوں اور اسی کا رہوں گا۔ میں اسے گھر سے بھگا کر ایک کھنڈر میں لے گیا۔ وہاں اس کے ایک بیٹی پیدا ہوئی۔ وہ

www.iqbalkalmati.blogspot.com

تمہاری امامی ہے۔"

امامی کی آنکھ کی پتلیاں جیسے چنگاریاں بن کر ابل پڑیں گی۔ اس نے چاہا کہ کھاٹ کے پائے سے اپنا سر پھوڑ ڈالے—— ناجائز اولاد!—— امامی کو محسوس ہوا جیسے وہ اس حقیر چوہیا سے بھی کمتر ہے، جو گلی میں کسی پتھر سے پچک کر کوڑے میں مل گئی ہو!

بہت دیر کے بعد دوست محمد بولا۔ "اس کی ماں؟"

"وہ اسی دن مر گئی۔ کھنڈر میں زچہ کی خبر گیری کون کرتا۔ وہ اسی دن مر گئی اور میں نے اسے چند دوستوں کی مدد سے دفنا دیا اور بچی کو اٹھا کر گھر لے آیا۔ لوگوں میں یہ مشہور کر دیا کہ جنگل میں بے یارومددگار لڑکی پڑی ملی اور میں اسے اٹھا لایا—— دوست محمد یہ باتیں سن کر تمہارے دل میں امامی سے نفرت تو پیدا نہیں ہو گئی؟"

"نہیں تو۔"

امامی تمام رات جاگتی رہی۔ اس کی آنکھیں سوج گئیں۔ کپڑے بھیگ گئے۔ ہونٹ پھٹ گئے۔

صبح اٹھی۔ جوہڑ پر پانی بھرنے کے لیے چلی گئی۔ ایک بار کیچڑ سے لت پت ایک بیمار کتیا اس کی راہ کاٹ کر جھاڑی میں گھس گئی! ایک طرف گاؤں کا بوڑھا کمہار گدھا لیے آرہا تھا۔

"آج صبح صبح کدھر گئے تھے چچا؟" امامی نے پوچھا۔

"قصبے میں۔"

"کیوں؟"

"دوست محمد کا اسباب لاری کے اڈے پر چھوڑنے۔"

"کدھر گیا وہ؟"

"بنوں۔ اس کی نوکری لگ گئی ہے نا۔"

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"ارے؟ ——"

امامی کے ہاتھوں سے اس کی گاگر چھوٹ کر جوہڑ میں جا گری۔ لہروں کے دائرے جھلمل کرتے دور تک پھیل گئے اور بیری کا ٹنڈ منڈ درخت بازو ہلا ہلا کر ناچنے لگا۔

* * *

www.iqbalkalmati.blogspot.com

چوری

دن بھر تھانیدار کے لیے جنگل سے لکڑیاں کاٹنے کے بعد غریب منگو گلی کے ایک نکڑ پر دیوار سے پیٹھ لگا کر ستانے کے لیے بیٹھ گیا تھا۔ اس کی نظریں اپنے پاؤں پر جمی ہوئی تھیں۔ ایڑیوں میں دراڑیں سی پڑ گئی تھیں اور انگلیوں سے خون پھوٹ کر ناخنوں کے کنارے پر جم گیا تھا۔ کچھ دیر کے بعد وہ اٹھا۔ اس کو اپنے گھر آٹا گوندھنے جانا تھا۔ اس کی ماں مر چکی تھی اور وہ ابھی تک کنوارہ تھا۔ ایک جگہ ایک بزرگ کے ذریعے کچھ بات چیت کی تھی۔ لیکن لڑکی والے پانچ سو روپے طلب کرتے تھے۔ اور اسے پیٹ بھرنے کے لیے پانچ پیسے بھی مشکل سے میسر آتے تھے۔ خاموش ہو رہا۔ اس نے سوچا۔ ویسے بھی گزر ہو ہی جائے گی۔ یہیں سمجھ لوں گا کہ شادی کرتے ہی بیوی مر گئی اور میں رنڈوا ہو گیا۔ پھر بھی کبھی کبھی جب کوئی عورت سر پر گاگریں رکھے، اٹھلاتی ہوئی، سینہ تانے اسے کنکھیوں سے دیکھ کر گزر جاتی یا دور کسی مکان کی چھت پر کسی دھوپ سینکتی دوشیزہ کی نظریں اس کی نظروں سے لڑ جاتیں تو وہ اپنی زندگی میں بہت بڑی کمی محسوس کرنے لگتا۔ لیکن، جلد ہی پیٹ کے دھندوں میں پھنس

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کر وہ اس تکلیف دہ احساس سے چھٹکارا حاصل کر لیتا۔

اس نے دو قدم اٹھائے۔ اچانک گاؤں سے باہر دور ایک گولہ چھوٹنے کی آواز آئی۔ اس کے کان کھڑے ہوگئے۔ ڈھول اور شہنائیوں کی آوازیں بھی اب صاف سنائی دینے لگیں۔ "کسی کی بارات آرہی ہے!" اس نے کہا اور وہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا اس طرف جانے لگا۔ اور پھر کنوارے اور رنڈوے تو براتیں دیکھنے کے دلدادہ ہوتے ہی ہیں!

اس سے ایک شخص نے پوچھا۔ "کدھر منگو' خیر تو ہے؟"

"خیر ہے بھائی! بس ادھر ڈھول کی آواز آئی۔ میں نے کہا۔ چلو رونق میلا ہی دیکھ لیں۔ کس کی بارات ہے آج؟"

"کیا کرو گے پوچھ کر —— جھوٹی براتیں!"

"جھوٹی براتیں؟" منگو نے متعجب ہو کر پوچھا۔

"ہاں جھوٹی براتیں —— سچی برات تو وہ ہوگی جس میں تم سہرا باندھ کر گھوڑے پر سوار ہوگے!"

منگو جھینپ گیا! اور وہ شخص ہنستا ہوا ایک طرف چلا گیا۔

دور سے اسے بیشمار مشعلیں نظر آئیں۔ جن میں بار بار کالے کالے ہاتھ کالی کالی صراحیوں سے تیل ڈالتے - آگے آگے علاقے کے مشہور میراثی تھے۔ دو ڈھول جن سے ریشم اور موتیوں کی لڑیاں لٹک رہی تھیں۔ دو شہنائیاں جن کے منہ بندوں پر سونے کا پانی چڑھا ہوا تھا۔ ایک بین باجا جس کی بے شمار توتیوں سے لٹکتے ہوئے سنہری پھندنے جھم جھم کر رہے تھے۔ میراثیوں کے پیچھے سوار تھے جن کے شملے موروں کی دموں سے بھی کچھ زیادہ پھیلے ہوئے تھے اور جن کی مونچھیں آسمانوں کی طرف اشارہ کر رہی تھیں۔ کئی سوار اپنی مریل مریل گھوڑیوں کی پسلیوں میں ایڑیاں گھیٹر گھیٹر کر انہیں ناچنے یا کم از کم اپنی گردنیں اٹھانے پر مجبور کر رہے تھے' جو نفرت انگیز انداز میں زمین کی طرف

جھکی ہوئی تھیں۔ کئی سوار اپنی خوبصورت بنی ٹھنی گھوڑیوں کو نچانے کی کوشش میں اپنا توازن قائم نہ رکھ سکتے تھے اور چیخ کر اردگرد کے لوگوں سے امداد کے طالب ہوتے تھے۔ ان کے پیچھے چار اونٹ تھے۔ جن کے ماتھوں پر' گھٹنوں پر' گردنوں میں' سینوں پر' موٹے موٹے گھنگھروؤں کی مالائیں بندھی ہوئی تھیں اور جن پر لدے ہوئے کجاوؤں میں کئی لڑکیاں بیٹھی تھیں جو اپنے آپ سے شرماتی اور لاج سے سکڑی جاتی تھیں۔ ان کے گال تمتمائے ہوئے تھے اور ان کے کانوں میں لٹکتے ہوئے بندے جھمر جھمر کر رہے تھے۔ ہوا میں لہراتی ہوئی اوڑھنیوں کو سنبھالنے کی کوشش میں وہ کئی بار اڑتی ہوئی پریاں معلوم ہوتی تھیں جو اپنے ارضی محبوب سے مل کر واپس ستاروں کی طرف جا رہی ہوں۔ کئی ایسی بھی تھیں جو اپنا شباب گزر جانے پر بھی اس طرح اکڑی بیٹھی تھیں جیسے سارے مجمع کی نظریں صرف ان پر پڑ رہی ہیں جبکہ ان کی طرف صرف ادھیڑ عمر کے رنڈوے دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے اپنے ہونٹ لال کر رکھے تھے اور بیشمار زیوروں کے بوجھ سے کجاوؤں میں جھک جھک جاتی تھیں۔ ان سب کے پیچھے پیدل چلنے والے تھے جن کے سرسراتے ہوئے لباسوں سے عطر کی لپٹیں آ رہی تھیں۔ فوجی سپاہیوں کا سب سے بڑا تحفہ عطر ہی تو ہے جس سے وہ لڑکیوں پر اپنا رعب جما سکتے ہیں۔

منگو بھاگا بھاگا آیا اور دو تین لجاتی لڑکیوں کو گھورتا اور ماتھے سے پسینہ پونچھتا پیدل چلنے والوں میں شامل ہو گیا۔ جب گولے چھوٹتے تھے اور گھوڑے بھڑکتے تھے تو برات میں نئی زندگی دوڑ جاتی تھی۔ جب شہنائی والے سر کو پیچھے لے جا کر شہنائیوں کا منہ آسمانوں کی طرف کرتے تھے اور ایک لمبی تان کھینچتے تھے اور ادھر سے پھلجھڑیاں تیر کی طرح آسمانوں پر جا کر نیلے' پیلے' سرخ اور سبز شراروں کی شکل میں اپنے پیچھے لکیریں چھوڑتی ہوئی واپس لپکتی تھیں تو یوں معلوم ہوتا تھا جیسے موسیقی کے جادو سے آسمان کے تارے کھنچ کھنچ کر شہنائیوں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

میں سما جانے کے لیے اڑے آ رہے ہیں۔

رات کا چہرہ خوشی کی وجہ سے تمتما اٹھا تھا۔

برات گاؤں میں داخل ہوئی۔ لوگ چھتوں پر چڑھ کر سجی ہوئی اور بنی ٹھنی لڑکیوں کو دیکھنے لگے۔ منگو کے جی میں آئی کہ چلو دولہا تو دیکھیں۔ آخر وہ خوش قسمت کون ہے جو ہمارے گاؤں کی کوئی لمبے لمبے بالوں اور گلابی گلابی رخساروں والی الھڑ لڑکی کو لینے آیا ہے۔ وہ تو نظر ہی نہیں آ رہا۔ وہ پیدلوں کے مجمع کو چیر کر آگے بڑھنے ہی والا تھا کہ شور مچ گیا۔ "میرا بٹوہ! میرا بٹوہ چوری ہو گیا۔" ——— اور اچانک بیشمار ہاتھ منگو کے کاندھے پر پڑے۔ "کدھر بھاگا جا رہا ہے' بدمعاش' بدذات۔"

منگو نے مڑ کر دیکھا۔ تیل اور گھی سے چمکتے ہوئے چہروں پر لال آنکھیں ابلی پڑتی تھی۔ برات رک گئی اور سارے مجمع نے منگو کو گھیر لیا۔

تمام برات پر پہلے تو ایک لمحہ کے لیے، خاموشی چھائی رہی۔ پھر اردگرد سے سرگوشیوں کی سرسراہٹ اٹھی اور اس کے بعد ایک شخص نے بڑھ کر منگو کو بالوں سے پکڑ لیا۔ منگو نے ایک لمحہ کے لیے سوچا کہ اس شخص کو کیسے جرأت ہوئی کہ اس نے ایک غیر گاؤں کے نوجوان کو یوں بالوں سے پکڑ لیا ہے۔ اسے کیسے معلوم ہوا کہ میں غریب آدمی ہوں اور مجھ سے کوئی ہمدردی نہیں کرے گا۔ اس نے اپنی پھٹی ہوئی قمیض کو دیکھا جس میں اسکی چوڑی چھاتی کے بال نظر آ رہے تھے ——— اس پر تمام اسرار منکشف ہو گئے۔

اس شخص نے کڑک کر پوچھا۔ "کدھر ہے بٹوا؟ کدھر ہے بٹوا کتے کے بچے!"

منگو کا خون کھول کر آنکھوں کے ڈوروں میں آ گیا۔ اسے یہ خیال نہ رہا کہ ایک غریب انسان تمام برات سے مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اس کے بازوؤں کے پٹھے پھڑکنے لگے۔ اس نے گھونسا تان کر اس شخص کے جبڑوں میں جما دینا

www.iqbalkalmati.blogspot.com

چاہا مگر سامنے ایک گھوڑی پر اسے گاؤں کا سردار نظر آیا۔ خیالات برقی سرعت سے اس کے دماغ کی شریانوں میں گردش کرنے لگے۔ "مجھے اپنے شہر کے سردار کے آگے فریاد کرنی چاہیے۔ میں نے کئی بار چوپال پر اس کے پاؤں دابے ہیں۔ اس کے گھر کے لیے لکڑیاں کاٹ لایا ہوں۔ اس کے کاموں پر دن میں تیس تیس کوس پیدل سفر کیا ہے۔ یہ غیر گاؤں والے میری بے عزتی کر رہے ہیں۔ تو اس میں سارے گاؤں کی بے عزتی ہے۔ میں نے بٹوا چرایا ہے تو میرے پاس موجود ہونا چاہیے۔" ——— اس نے وہیں سے چیخنا شروع کر دیا۔ "ملک جی آپ کا اقبال بڑھے مجھے ان بدمعاشوں نے گھیر لیا ہے۔" ——— اب اس کے بالوں پر سے مضبوط ہاتھ علیحدہ ہو چکا تھا ——— "ملک جی۔ مجھ پر یہ ناحق الزام دھر رہے ہیں۔ ملک جی آپ بہت خوب جانتے ہیں۔ میں نے آج تک کہیں چوری نہیں کی۔ میں غریب ہوں مگر اپنی حلال کمائی سے پیٹ بھرتا ہوں۔ آپ جانتے ہیں۔ سارا گاؤں جانتا ہے۔ خدا جانتا ہے۔"

اس نے اپنی آنکھیں بے حد اشتیاق سے سردار کے چہرے پر گاڑ رکھی تھیں۔ وہ منتظر تھا کہ ابھی سردار کے منہ سے گالیوں کا طوفان نکلے گا' برات والوں کے چھکے چھوٹ جائیں گے اور وہ فخر سے اکڑتا ہوا اپنے گھر آکر آٹا گوندھنے لگے گا۔

لیکن سردار کی للکار اس پر بجلی بن کر گری۔ "بدمعاش' جیب کترے' حرامزادے تجھے شرم نہیں آتی؟ گھر آنے والوں کی یوں خاطر کی جاتی ہے؟ سارے گاؤں کی ناک کاٹ کر رکھ دی۔ کدھر ہے بٹوا؟ نکال اسے' نکال۔"

اب اس کی پیٹھ پر سردار کا پتلا چابک شڑاپ شڑاپ پڑ رہا تھا۔ "نکال ورنہ تیری مشکیں کس کر اور الٹا لٹکا کر مرچوں کا دھواں دوں گا' مرچوں کا۔"

"حضور۔ مجھے خدا کی قسم' مجھے قرآن کی قسم' مجھے ———"

"بٹوا نکال' کہاں رکھا ہے' کس جھاڑی میں پھینکا ہے؟ کسے دیا ہے؟

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کدھر ہے بٹوا؟ کدھر ہے؟" —— اور ہر جملے پر اس کی پیٹھ پر ایک ایسا چابک پڑتا تھا کہ اس کی جلد سر سے لے کر پاؤں تک طنبورے کے تاروں کی طرح لرز کر رہ جاتی تھی۔ لیکن وہ خاموش رہا۔ اسے معلوم تھا کہ اس کی ایک نہیں سنی جائے گی۔ خدا اور قرآن ان کی نظروں میں کھلونے ہیں۔ ان پر قسمیں کوئی اثر نہیں کریں گی۔ جس بوڑھے کا بٹوہ گم تھا وہ پاگلوں کی طرح چیخ رہا تھا۔ دس روپوں کے سات نوٹ۔ دس روپوں کے سات نوٹ۔ دس کم اسی روپے! لوگو! میں لٹ گیا۔ میں نے اس شخص کو تیزی سے بھاگتے دیکھا تھا۔ یہی میرا چور ہے۔" بوڑھے کی زبان تیزی سے چل رہی تھی اور اس کے منہ سے جھاگ کے قطرے اڑ اڑ کر اس کی گنجان داڑھی پر چمک رہے تھے۔

سردار کے حکم سے برات آگے بڑھنے لگی اور منگو کو گاؤں کے دو چوکیداروں کے حوالے کر دیا گیا جو اسے چوپال پر لے آئے۔ کچھ دیر بعد سارا گاؤں اور سب برات والے چوپال پر آموجود ہوئے۔ اندھیری رات تھی اور ایک نائی کے ہاتھوں میں ایک مشعل جل رہی تھی۔ تھانے سے ایک حوالدار اور ایک سپاہی بھی بلائے گئے۔ جنھوں نے اس کی جامہ تلاشی میں اس کی جیب میں سے چونی نکال لی۔

منگو زمین پر بیٹھا ایک تنکے سے مٹی کرید رہا تھا اور سوچ رہا تھا۔ "جس کمبخت نے بٹوا چرایا ہے وہ مجھ پر رحم کھا کر بٹوا چوپال کے وسط میں کیوں نہیں پھینک دیتا؟ غریبوں پر لوگ ترس کیوں نہیں کرتے؟ سب میری مصیبت پر مسکرا کیوں رہے ہیں؟ عجیب بات ہے! عجیب قانون ہے! عجیب سمجھ ہے؟"

وہ اٹھ کر حوالدار کے سامنے آگیا۔ "حوالدار جی۔ میں آپ کے آگے سچی سچی بات کہہ دوں گا۔ آپ کو یقین آجائے تو خیر۔ نہیں تو آپ کی مرضی کے آگے میرا کوئی بس نہیں۔ سارا گاؤں مجھے خوب جانتا ہے۔ بدقسمتی سے برات دیکھنے چلا گیا۔ ایک بار خیال آیا' چلو دولہا تو دیکھ لوں۔ جانے لگا تو شور مچ گیا اور سب نے مجھے آن دبوچا۔ میرے تیز قدموں سے انہیں غلطی ہوئی۔ چور ان کا

اپنا ساتھی ہو گا۔"

لیکن حوالدار جی کی جیب بھاری ہو چکی تھی۔ وہ مسکرا دیئے اور سگریٹ کا دھواں اپنے چوڑے نتھنوں سے نکالتے ہوئے بولے۔ "چوری کرنے والے خودبخود اقبال کر لیں تو سرکار کو ہمارے محکمہ کی ضرورت ہی نہ رہے۔ تیری ہتھیلیوں پر گرم گرم انگارے دھرے جائیں گے۔ تیرے سینے پر پتھر کوٹے جائیں گے۔ تجھے ہفتہ ہفتہ بھر بھوکا پیاسا حوالات میں بند رکھا جائے۔ تب تو خودبخود پکار اٹھے گا۔ "حضور بٹوا فلاں جگہ پڑا ہے۔" برخوردار' ہم پولیس والے ہیں پولیس والے!" اور حوالدار نے اپنی گردن کو کچھ اس طرح ٹیڑھا کیا جیسے وہ زمین و آسمان کو حوالات میں بند کر دینے پر قادر ہے!

منگو نے ایک بار سردار کی طرف دیکھا لیکن اس کے انداز سے انتہائی بیخبری اور بے توجہی کا اظہار ہو رہا تھا۔ وہ ایک زمیندار سے گندم کے بھاؤ کے متعلق باتیں کر رہا تھا۔

حوالدار نے اپنی آنکھیں یوں نکالیں جیسے ابھی تڑاخ سے باہر آ پڑیں گی۔ تمام مجمع دم بخود کھڑا تھا۔

"جاؤ۔" حوالدار نے اپنا موٹا ڈنڈا منگو کی گردن پر جمائے ہوئے کہا۔ "کھڑے کیا تک رہے ہو۔"

"لیکن حضور مجھے کچھ خبر نہیں۔ میں کہاں سے لاؤں۔ میں نے بٹوے کا نام تو سن رکھا ہے مگر ابھی تک اس کی شکل نہیں دیکھی۔ میں غریب آدمی ہوں حضور۔"

"لے آؤ بٹوا۔ جہاں رکھا ہے لے آؤ۔ جسے دیا ہے لے آؤ۔ ورنہ۔ ورنہ۔" ڈنڈا منگو کی چھاتی پر آن گرا۔

اس نے ایک کونے میں مسجد کے مولوی صاحب کو دیکھا تو پکار کر کہا۔

"مولوی جی! دیکھئے نا میں ———"

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"مگر بچے' چوری بری چیز ہے نا!"

وہ اپنی تمام نمازوں کو برباد سمجھنے لگا جو اس نے اس امام کے پیچھے پڑھی تھیں! اسے حوالدار کا ایک اور دھکا لگا۔ "لے آؤ بٹوا۔"

وہ ناچار سر جھکائے چوپال کی سیڑھیوں سے اترنے لگا۔ اس کے پیچھے ایک سپاہی اور دو چوکیدار تھے۔ اچانک ایک شخص تیزی سے اس کے قریب سے گزرتے ہوئے بولا۔ "کیوں جی برات والے یہیں ہیں؟"

"ہاں۔" منگو نے جواب دیا۔ شاید وہ بھی کوئی براتی تھا۔ کیونکہ اس کا کلف لگا شملہ اوپر بہت دور تک چلا گیا تھا۔

وہ چوپال پر چڑھ گیا اور بولا۔ "ارے شیر باز۔ بابا شیر باز یہیں موجود ہو گیا؟"

"ہاں ہاں" شیر باز اٹھا ——— یہ وہی بوڑھا تھا۔ جس کا بٹوہ کھو گیا تھا!

"میں نے راستے میں سنا کہ تم نے ایک بے گناہ پر بٹوے کی چوری کا الزام دھر دیا ہے حالانکہ تم نے مجھے اپنا بٹوہ پکڑایا تھا کہ کہیں بھیڑ میں گم نہ ہو جائے۔"

"ارے ——— میں تو بھول گیا۔ تمہارے پاس ہے بٹوا؟" بوڑھے کی باچھیں خوشی کے مارے کانوں کی لوؤں تک پھیل گئیں!

منگو کا جسم غصے سے دہکنے لگا۔ چوکیدار اور سپاہی واپس ہو پڑے مگر اس نے وہیں سے کھڑے ہو کر پوچھا۔ "میں جا سکتا ہوں؟"

منگو گھر آیا تو اسے اپنی چونی کا خیال ستانے لگا۔ "میری دن بھر کی کمائی اس کی جیب میں موجود ہے۔ یہ کہاں کا قانون ہے؟ میں اپنی چونی ضرور لوں گا۔ ضرور لوں گا۔" وہ واپس ہو پڑا۔

چوپال پر پہنچا تو لوگ جا چکے تھے۔ وہ تھانے کی طرف دوڑنے لگا۔ ایک کمرے کی کھڑکی کھلی تھی۔ اندر لیمپ جل رہا تھا۔ وہ کھڑکی کے پاس چلا گیا۔ اندر

www.iqbalkalmati.blogspot.com

جھانکا تو وہی حوالدار اور سپاہی ایک چارپائی پر بیٹھے شیشے کے گلاس میں کوئی سرخ چیز پی رہے تھے۔

"حضور" اس نے آہستہ سے کہا۔

دونوں کے ہونٹوں سے گلاس بیک وقت جدا ہوئے۔ اور چارپائیوں تلے رکھ دیئے گئے۔

"کون؟" حوالدار نے پوچھا۔

"حضور میں ـــــ منگو۔"

"کیا ہے؟"

"حضور۔ اس شخص کا بٹوہ مل گیا تھا نا؟"

"ہاں۔"

"پھر حضور ـــــ"

"کیا؟"

"میری چونی مجھے مِل جائے!"

حوالدار اور سپاہی اس زور سے ہنسے کہ حوالات کی سلاخوں سے بھی ایک گونج اٹھنے لگی۔ منگو ان بے معنی قہقہوں سے متعجب ہی ہو رہا تھا کہ کھڑکی کھڑاک سے بند ہو گئی اور درد کی شدت سے وہ اپنی ٹھوڑی اور ناک کو انگلیوں میں دبا کر رہ گیا۔

* * *

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کھیل

بوڑھا کھانستے کھانستے بے حال ہو گیا کھاٹ پر گٹھڑی کی طرح سمٹ کر پکارا۔ "ارے رانی۔ گھونٹ بھر پانی پلا دے، حلق چھل گیا ہے۔"

رانی باہر دھوپ میں چھاج پٹخا رہی تھی۔ لپک کر اندر آئی اور مٹی کے ایک پیالے میں پانی بھر کر بولی۔ "دوا دارو تو جی بہلاوے کے بہانے ہیں بابا۔ کہو تو کل پرسوں پیر جی سے تعویز لے آؤں۔ کہتے ہیں ان کے تعویز کی برکت سے مرنے والے بھی بنا کسی سہارے کے اٹھ کر بیٹھ جاتے ہیں۔ چلی جاؤں کل؟"

اور بوڑھا پانی پی کر اور الجھی ہوئی بھوری مونچھوں پر اپنی کھدر کی چادر گراتے ہوئے بولا۔ "کیا کرے گی جا کر، پیر جی کی شان میں گستاخی کروں تو میری زبان جل جائے لیکن اگر ان کے کلام میں اثر ہوتا تو تیرا شیرو کیوں موت کے گھاٹ اتر جاتا۔ میں اللہ کے کرم کا امیدوار بیٹھا ہوں اور ویسے مجھے اب جینے کی کوئی اتنی بڑی آرزو بھی نہیں۔"

رانی بوڑھے کی اکلوتی بیٹی تھی۔ اسی گاؤں کے ایک البیلے جوان سے بیاہی گئی۔ برات پلٹی تو اس کی ڈولی پر سے چمکتے اور کھنکتے سکے گزر کر آس پاس

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بچوں کے جمگھٹ میں بکھر بکھر گئے۔ اور جب اس نے نئے گھر کی دہلیز پر قدم رکھا اور اس کی ساس نے خالص سونے کا ایک ست لڑا ہار اس کے زریں جوتوں پر ڈال دیا تو دنیا بھر کی کنواری اور بیاہی لڑکیوں کے جم غفیر میں وہ خود اپنے آپ کو سب سے بلند نظر آنے لگی۔ دو تین مہینے تو گھر سے باہر قدم دھرنے ہی کی نوبت نہ آئی۔ ہر وقت خوبصورت شیرو اس کے سامنے رہتا اور ساس اسے دیکھ دیکھ کر پڑوسنوں سے کہا کرتی۔ "اللہ اسے ہم سب کی نظر بد سے بچائے مگر میں اتنا تو ضرور کہوں گی کہ جہاں میری رانوں ایک بار قدم رکھتی ہے وہاں سے سات دن تک خوشبوئیں اٹھتی رہتی ہیں اور جہاں بیٹھتی ہے یوں معلوم ہوتا ہے جیسے جاگیردار جی کی بجلی کی لالٹین پڑی لس لس کر رہی ہے۔ میں تو اپنے بھاگ پر ناز کرتی ہوں کہ آخری عمر میں میرا کلیجہ ٹھنڈا ہوا۔"

مگر اچانک اس نازو نعم کی بساط الٹ گئی۔ شیرو کبڈی کھیلنے کہیں میلے پر گیا۔ وہاں اس کی ٹانگ ٹوٹ گئی۔ ہسپتال لایا گیا۔ زخم میں زہر بھر گیا۔ ہفتہ دس دن تڑپا' بلبلایا اور ایک اداس صبح کو جب ہسپتال سے باہر راستے پر کوئی چرواہا بانسری بجاتا جا رہا تھا' اس نے رانی کے زانو پر دو تین بار سر جھٹکا اور ٹھنڈا ہو گیا۔ رانی جب گھر واپس آئی تو رونے پیٹنے میں مصروف ہو گئی اور جب ماتم کی مدت ختم ہوئی تو ایک روز ایک کونے میں سمٹی ہوئی آنسو بہا رہی تھی کہ ساس اندر داخل ہوئی اور کڑک کر بولی۔ "اب تو کب تک میرے شیر کے غم میں نمائشی سوگ منائے گی؟ میرے لال کو نگل کر اب تو اس گھر کی رانی بن کر نہیں رہ سکتی۔ اٹھ کر چکی پیس اور برتن مانجھ اور کپڑے دھو۔ یوں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھی رہی تو آج ہی سن لے کہ دھکے دے کر میکے پہنچا دوں گی تجھے۔ کس کنگلے گھر میں میرے شیر کے لیکھے لکھے تھے کہ وہ بجلی کی طرح چمکا اور ہمیشہ کے لیے قبر میں جا سویا۔"

یہ اس رویے کی ابتداء تھی جو آخر میں شدت اختیار کرتا گیا اور جب

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ایک روز بڑھیا نے اس کے سر پر سے دوپٹہ نوچ کر الگنی پر لٹکا دیا اور کھدر کی ایک بوسیدہ چادر اس کے منہ پر دے ماری اور بولی۔ "ان رنگ برنگے دوپٹوں سے تو پڑوس کے چھوکروں کو اپنے بس میں لانا چاہتی ہے کٹنی۔ کل تو چھت پر کھڑی جاگیردار کے بیٹے سے کیا اشارے کر رہی تھی؟" ——تو وہ اٹھی اور بوڑھی ساس کی آنکھ بچاتی اپنے پرانے گھر آگئی۔ باپ کو سارا حال کہہ سنایا۔ وہ اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔ "اونچی بیری پر ہر کوئی نہیں چڑھ سکتا میری بچی۔ لیکن چھوٹے سے بیروٹے کو ہر راہ چلتا جھٹکائے گا۔ تیری قسمت کہ تیرا مالک اس قدر جلد چل بسا۔ لیکن جب تک میں زندہ ہوں اور پیٹھ پر من بھر لکڑیاں اٹھا سکتا ہوں تیری طرف کوئی آنکھ تک نہ اٹھا سکے گا۔ میں نے تیرے سوا اس دنیا میں دیکھا ہی کیا ہے۔"

اور یوں اس کی زندگی کا وہ دور شروع ہوا جس میں سوائے دبی دبی آہوں اور گھٹے گھٹے دکھی گیتوں کے اور کچھ نہ تھا۔ کئی بار جب ساون کی گھٹائیں اودے پربتوں کے پیچھے سے گرجتی ہوئی اٹھتیں اور گاؤں کے کھلے مرغزاروں میں ٹھنڈی ہوائیں چلنے لگتیں۔ جب تیز بوندوں سے اس کے گھر کے بوسیدہ کواڑ بجتے اور دوشیزائیں نیموں میں جھولے ڈال کر رسیلے ملہار گاتیں تو اس کے دل میں ایک پھول سا کھلتا جو اپنی پنکھڑیوں کو نچاتا اور اپنی خوشبو سے رانی کے دماغ میں جھولنوں میں جھولنے اور اونچے اونچے ملہار الاپنے کی آرزوئیں بھر دیتا تو یکایک اس کے کانوں میں کوئی احساس ایک سرگوشی کرتا اور وہ اپنے دراز بالوں کی گرد آلود لٹوں کو کانوں کے پیچھے جما کر چھاج اٹھا لیتی اور اس کی پُھنک کی دھن پر دکھے دکھے دبے دبے گیت گاتی!

ہم بدقسمت روحیں دنیا بھر کے دکھوں کی امین ہیں
ہماری آنکھوں کو مسکراتے ہوئے پھول، جگمگاتے ہوئے
تارے اور لہلہاتے ہوئے مرغزار دیکھنے کا کوئی حق

www.iqbalkalmati.blogspot.com

نہیں کیونکہ ہم کملائے ہوئے شگوفوں' بھیانک اندھیروں
اور اجڑے ہوئے کھیتوں کی دنیا میں بسنے والے ہیں

کئی بار اسے وہ نوجوان چرواہے بہت پیارے لگے جو چراگاہوں میں بھیڑ بکریوں کے پیچھے ہولے ہولے قدم اٹھاتے ایسے گیت گاتے کہ اسے انگڑائیاں آنے لگتیں۔ لیکن اچانک اس کے دل میں یہ جذبہ ٹیس بن کر اٹھتا کہ اس کی روح اور جسم مرحوم شیرو کی امانت ہے جسے کوئی چھو تک نہیں سکتا اور یوں وہ ٹھنڈے جھونکوں پر لدے ہوئے سریلے گیتوں اور بنسریوں کی تانوں کو سن کر اپنا من پر چالیتی اور جب اس کا باپ دن بھر جنگل میں لکڑیاں چن کر گھر آتا تو اس کے پاؤں دابتی اور کہتی۔ "بابا مجھے کہیں سے ایک طوطا تو لا دو۔ یا کوئی مینا۔ یا کوئی چکور۔ میں اکیلے بیٹھے بیٹھے گھبرا جاتی ہوں۔ ایک بلی تھی اسے بھی جاگیردار جی کے کتے نے پھاڑ ڈالا ورنہ اسی سے جی بہلتا رہتا تھا۔"

اور بوڑھا جسے جوان دلوں کی دھڑکنوں پر کافی عبور حاصل تھا' کہتا "لا دوں گا میری بچی۔ میں خود دن بھر کڑھتا رہتا ہوں کہ تو اکیلی بیٹھی کیا کرتی رہتی ہوگی۔ ادھر پڑوس میں خدا یار کے گھر چلی جایا کر۔ سنا ہے اسکے آنگن میں شیشم کے ساتھ جھولا پڑا ہوا ہے۔"

اور وہ اداس لہجے میں جواب دیتی۔ "بابا۔ وہ بہت زور سے ہنستی ہیں اور جھولے بہت اونچے چڑھاتی ہیں۔ ان کے دوپٹے سر پر سے اڑ جاتے ہیں۔ بال بکھر جاتے ہیں۔ لہنگے اور چولے ہوا میں پھڑپھڑاتے ہیں مگر وہ تو یوں ناچتی گاتی رہتی ہیں جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ اتنے زور زور سے ہنسنے والوں میں کوئی بہت تھوڑا ہنسے تو اس سے سب نفرت کرنے لگتے ہیں۔ ایک دن میں گئی تھی وہاں۔ سب کہتی تھیں رانو پر شیرو کی موت کا سایہ ہے!"

یونہی بے بس آرزوؤں اور بے سود ارادوں میں وقت کٹتا رہا کہ اچانک ایک روز رانی کے کلیجے پر چھریاں چل گئیں۔ وہ اپنے آنگن میں بیٹھی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

تنکوں سے زمین پر لکیریں کھینچ رہی تھی کہ دروازہ کھلا۔ جاگیردار جی کا نوجوان بیٹا اندر آیا اور اس کے بالکل قریب ہو کر بولا۔

"کیا ہو رہا ہے؟"

رانی کے دل پر جیسے کسی نے ہتھوڑا چلا دیا ہو۔ جھینپ کر بولی۔ یونہی بیٹھی ہوں۔"

وہ اس کے قریب بیٹھتے ہوئے بولا۔ "یونہی بیٹھی کیا کر رہی ہو؟"

اور وہ پرے کھسکتی ہوئی بولی۔ "کیا مطلب؟"

"مطلب" وہ بولا۔ "کہ تم اپنی جوانی کو یوں برباد کر رہی ہو جیسے کوئی گلاب کے تازہ پھول کو گھورے پر پھینک دے۔"

رانی تن کر کھڑی ہو گئی۔ اور اسے ڈپٹ کر بولی۔ "منہ سنبھال کر بول رے۔ تو جاگیردار کا بیٹا ہے' یہ میں جانتی ہوں۔ لیکن پرائی بہو بیٹیوں سے مذاق کرنے کا تجھے کوئی حق نہیں۔ چل دور ہو یہاں سے۔ میں تیرے ایسے منہ پھٹ چھوکروں کے منہ پر تھوکتی ہوں۔"

اور نوجوان اٹھتے ہوئے بولا۔ "چھپکلی میرے سامنے تنتی ہے! مزا چکھاؤں گا تجھے اس غرور کا۔ میں تیری ایسی کئی بی بیوں کو بیچ کر کھا چکا ہوں۔ تُو تو میرے ایک داؤ کی مار ہے۔"

اور جب نوجوان چلا گیا تو رانی نے یوں محسوس کیا جیسے بیشمار ننھے ننھے خوشرنگ پھولوں کی کیاریوں کو روند کر نکل گیا ہو۔ دن بھر وہ یہی سوچتی رہی کہ ایسا کیوں ہوا۔ اور جب اسے یہ خیال آیا کہ وہ بیوہ ہونے کے باوجود جوان ہے' اس کی آنکھوں میں مستیاں اور لبوں میں رس ہے تو وہ گھبرا سی گئی اور آنگن میں یوں کھوئی کھوئی پھرنے لگی جیسے وہ کسی ایسی چٹان کی تلاش میں ہے جس پر سے چھلانگ لگا کر وہ اپنے شباب کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ کر دینا چاہتی ہے۔

جب بوڑھا جنگل سے واپس آیا تو ایک بار تو رانی کے جی میں آئی کہ

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اسے سارا حال کہہ سنائے۔ مگر پھر رک گئی کیونکہ اس کا باپ بہت ضعیف تھا۔ اور ذرا ذرا سی باتیں اس پر اتنا اثر کرتی تھیں کہ اسے رعشہ چھوٹ جاتا تھا اور بہت دیر تک دھندلی آنکھوں سے آنسو نہیں تھمتے تھے۔

جاگیردار کا بیٹا اس کی تاک میں رہنے لگا۔ جب وہ پنگھٹ پر جاتی تو کہیں سے ایک کنکر اڑتا ہوا آتا اور اس کی گاگر میں سوراخ کر ڈالتا۔ اس کے کپڑے بھیگ جاتے اور پنہاریاں اس کی حالت پر بل کھا کھا کر ہنستیں اور شریر بچے شہتوت کے تنے کے پیچھے چھپ چھپ کر تالیاں بجاتے۔ گلی میں جا رہی ہوتی کہ اچانک اس کے سامنے دو چار ٹھیکریاں آگرتیں اور جب وہ گھبرا کر ادھر ادھر دیکھتی تو کچی دیواروں کی پرلی طرف اسے دبے دبے قہقہے سنائی دیتے۔ شام کے اندھیرے میں کئی بار کسی نے اس کا دوپٹہ کھینچ لیا۔ وہ چیخنا چاہتی مگر چیخ نہ سکتی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ وہ ایک بیوہ ہے اور اگر بیوہ کا دوپٹہ اندھیری گلی میں کھینچ لیا جائے تو سب اسی کو کوسیں گے' اور پھر ان تمام حرکتوں کے پیچھے جاگیردار کا بیٹا تھا جس کی زمینیں بہت دور تک پھیلی ہوئی تھیں۔ جس کی بیس بھینسیں تھیں اور دس گائیں تھیں اور جو گاؤں کا سب سے بڑا بدمعاش ہونے کے باوجود عزت کی نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا!

بوڑھی کٹنیاں اسے آکر چھیڑتیں اور کہتیں۔ "اری پھولوں سے کھیل کہ پھولوں میں حسن بھی ہے اور خوشبو بھی۔ تجھے کانٹوں میں پڑے پڑے کیا مزا ملتا ہے۔ ادھر آ میرے ساتھ تجھے اس دوزخ سے اٹھا کر جنت میں بٹھا دوں۔"

——— وہ ان پر غصے ہوتی۔ کئی بار جلتی ہوئی لکڑی اٹھا کر ان کے پیچھے بھاگتی۔ کئی بار دروازہ بند کر کے بیٹھ جاتی اور تب تک نہ کھولتی جب تک اس کا بوڑھا باپ نہ آجاتا۔ "ارے رانو دروازہ کھول" ——— وہ پکارتا اور رانی کو یوں محسوس ہوتا جیسے وہ دن بھر شکنجے میں پھنسی رہی اور اب آزاد ہوئی ہے۔

کئی بار اس نے سوچا کہ بابا بہت بوڑھا ہے اور میں ابھی سترہ کی بھی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

نہیں۔ مجھے ابھی دنیا میں بہت دنوں تک رہنا ہے۔ کیوں نہ اس جھنجھٹ سے چھٹکارا پالوں اور اس امانت کو جاگیر دار کے بیٹے کے ہاتھ بیچ ڈالوں۔ مگر پھر اسے خیال آتا کہ بدمعاشوں کی طرح پرائے گھروں میں جا دھمکنا اور پھر پرائی لڑکیوں کو لفنگوں کی طرح چھیڑنا کوئی اچھی بات نہیں۔ امیروں کے یہ من بھاتے کھیل ہیں اور کوئی عجب نہیں کہ وہ ایک گیند سے کھیل کھیل کر جب تھک جائے تو ایک نئی گیند خرید لے اور یوں وہ بیشمار گھسی اور پھٹی ہوئی گیندوں کے انبار تلے دب کر دم گھٹ کر مرجائے! اس لیے اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ وہ ہر آفت کا مقابلہ کرے گی مگر جب تک اس کے دل میں شیرو کی یاد ہے اور اس کا بوڑھا باپ زندہ ہے وہ کسی چھوکرے سے آنکھ تک نہیں ملائے گی۔

پچھلے چند دنوں سے اس کا باپ بیمار رہنے لگا۔ وہ دن بھر اس کے لیے دوا دارو کا انتظام کرتی یا چھاج پٹخاتی اور چکی پیستی رہتی اور جب چند دنوں کے بعد گھر کی پونجی ختم ہو گئی تو ایک رات دونوں اکٹھے بیٹھ کر یہ سوچتے رہے کہ اب کیا کیا جائے؟

نوجوان بیوہ کو اپنے پیٹ کی بجائے اپنے ضعیف باپ کے علاج کا خیال تھا۔ بہت ردوکد کے بعد اس نے باپ سے یہ فیصلہ کر لیا کہ اب دو تین دنوں کے وقفے کے بعد وہ خود ہی جنگل میں جا کر لکڑیاں چن لایا کرے گی اور انہیں بیچ کر دوا دارو کا انتظام ہو جائے گا۔

آج اسے لکڑیاں چننے جانا تھا۔ چھاج وغیرہ اندر رکھ کر کھانستے ہوئے بیمار باپ سے اجازت مانگی۔

"جلد لوٹیو' میری بچی۔" وہ بولا۔ "آج مجھے بخار ہے اور کھانستے کھانستے میری سانسیں رک رک جاتی ہیں۔ کالی ڈھیری کے دائیں جانب جو کھائی ہے نا اس میں اتر جائیو۔ ایک گھومتی ہوئی پگڈنڈی تجھے نیچے پہنچا دے گی۔ سنبھل سنبھل کر قدم رکھیو۔ کھائی میں تجھے بہت سی سوکھی لکڑیاں مل

جائیں گی اور دیکھو اگر تو شام تک واپس نہ آئی تو فکر سے مرجاؤں گا میں۔ مجھے تو آج بار بار پیاس لگ رہی ہے اور خود کھاٹ سے اٹھا تک نہیں جاتا۔"

رانی نے پانی کا ایک برتن بھر کر کھاٹ کے پائے سے ٹکا دیا اور کاندھے پر رسی ڈال کر جنگل کا رخ کیا۔ دو تین بار وہ پہلے بھی اس جنگل میں آچکی تھی اور اس کی تنہائیوں میں اس نے وہ گیت خوب جی کھول کر گائے تھے جو کنواری لڑکیاں ساون میں جھولوں پر جھولتی ہوئی الاپتی ہیں۔ خوبصورت درختوں سے باتیں کرتی رہتی ہیں۔ پست قد گنجان جھاڑیوں کو چھیڑتی' سفید چٹانوں پر پھسلتے ہوئے جھرنوں میں چھینٹیں اڑاتی' دیر تک ہنستی رہتی اور جب ہنستے ہنستے اور گاتے گاتے تھک جاتی تو سوچتی رہتی کہ وہ کیوں ہنسی اور گائی۔ اور پھر اچانک جاگیردار کا بدمعاش بیٹا اس کے ذہن پر ابھرتا اور پوچھتا۔ "کیا کر رہی ہو؟" —— اور اس کے دماغ میں آندھیاں سی چلنے لگتیں اور اس کا سارا وجود غم و غصہ کے جذبات سے دھڑکنے لگتا۔

اور آج اگرچہ اس کے دل پر باپ کی خطرناک علالت کا بوجھ تھا لیکن گنجان درختوں کی ٹھنڈی چھاؤں' کھلی فضاؤں پر تیرتے ہوئے بیشمار پرندوں اور بہت دور کسی گاؤں سے اٹھتے ہوئے دھوئیں کو دیکھ کر اس کے دل نے ایک پھریری سی لی اور وہ کالی ڈھیری کے اس طرف گہری کھائی میں اتر کر بہت دیر تک یہ گیت گاتی رہی:۔

زندہ نہیں رہا جاتا کیونکہ زندہ رہنے کا سامان موجود نہیں
موت قبول نہیں کی جاتی کہ جوانی کی موت بہت بھیانک ہوتی ہے
اے تاروں کی شمعیں جلانے والے' مجھے زندگی اور موت کی
ملتی ہوئی سرحدوں پر لے جا کر بسا دے۔ جہاں میرا دل' دھڑکنے اور
دھڑکتے دھڑکتے رک جانے کا لطف اٹھا سکے!

کسی ان پڑھ نوجوان دہقان کے یہ گیت اسے نئی نئی دنیائیں دکھاتے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

رہے اور جب وہ لکڑیاں چن چکی تو اچانک عقب سے اسے بہت سے پاؤں کی چاپ سنائی دی۔ جاگیردار کا بیٹا جنگل کے داروغے کو ساتھ لیے اینڈتا چلا آرہا تھا۔ اگر وہ بلندی پر کھڑی ہوتی تو شاید نیچے چھلانگ لگا دیتی لیکن یہاں نشیب میں اسے کوئی ایسی راہ نظر نہ آئی جو اسے ان دو بھیڑیوں کے چنگل سے آزادی دلا سکے۔

جنگل کا داروغہ اپنی مونچھوں کے دونوں سروں کو مروڑتا ہوا بولا۔ "سرکاری جنگل کی لکڑیاں بھی چوری کرتی ہے۔ اور زور زور سے گاتی بھی ہے تاکہ ہم دس میل پر بھی کھڑے ہوں تو بھانپ جائیں کہ کوئی چور جنگل میں من مانی کر رہا ہے۔"

"میں چور نہیں ہوں۔" وہ خوفزدہ ہو کر بولی۔ "میں خشک لکڑیاں اکٹھی کر رہی تھی اور سرکار نے خشک لکڑیوں کی اجازت تو دے رکھی ہے۔ دیکھ لیجئے میرے پاس کوئی کلہاڑی ولہاڑی نہیں۔ میں چور نہیں۔"

اور جاگیردار کا بیٹا سینے پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا۔ "تم چور ہو۔ تم نے تو بہت دنوں سے میرا دل چرا رکھا ہے۔ تمہیں اس چوری کی سزا ملے گی۔ تم کلہاڑی کے بجائے اپنی یہ خوبصورت آنکھیں اور یہ رس بھرے ہونٹ اور یہ لہراتے ہوئے بال استعمال کرتی ہو۔" ——— اور نوجوان ترچھی نظر سے داروغہ کی طرف دیکھ کر زیر لب مسکرایا اور بولا۔ "کیوں جی آپ کا کیا خیال ہے؟"

رانی چیخنے لگی۔ "مجھے بے بس دیکھ کر تم ایسی ذلیل باتیں کرتے ہو۔ قسم خدا کی میں جھپٹ کر منہ نوچ لوں گی تمہارا۔"

اور داروغہ اپنی جیب سے چند کاغذات نکالتا ہوا بولا۔ "بہت شور نہ مچا اور یاد رکھ کہ جو لوگ میرے سامنے اونچی آواز میں بولتے ہیں میں انہیں ایسا دھکا لگاتا ہوں کہ عمر بھر انہیں کوئی ٹھور ٹھکانہ نہیں ملتا۔ لے نکال انگوٹھا۔ سو روپیہ جرمانہ ہوا تو تیری ساری طراریاں اور شیخیاں دھری رہ جائیں گی۔"

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"ادھر لا انگوٹھا۔" جاگیر دار کا بیٹا بولا اور اسے کلائی سے پکڑ کر کالے رنگ میں اس کا انگوٹھا بھگویا اور داروغہ کے کاغذ پر لگا دیا اور بولا۔ "اگر تو اس جرمانے سے بچنا چاہتی ہے جس کی وجہ سے تیرا گھربار قرق ہو جائے گا اور تو اپنے باپ سمیت باہر چٹانوں پر گل سڑ کر مرجائے گی تو کل اسی وقت یہاں پہنچ جانا۔ سمجھیں؟ کل اسی وقت یہیں مجھے تم سے بہت سی باتیں کرنا ہیں!"

"کیسی باتیں؟" رانی نے کانپتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

اور نوجوان نے جھپٹ کر اسے دبوچ لیا اور اس کا منہ چوم کر بولا۔

"ایسی باتیں"۔——دیوانوں کی طرح چیخ چیخ کر اس نے سارا جنگل سر پر اٹھالیا۔ ہونٹوں کو یوں رگڑتی رہی جیسے ان سے دو بچھو چمٹ گئے ہوں اور پے در پے ڈنک لگائے جارہے ہوں۔ اس کے دماغ میں طوفان سے چلنے لگے اور وہ کھائی کی اونچی نیچی سطح پر یوں گھومنے لگی جیسے وہ اسے پھاڑ کر اس کے اندر سما جانا چاہتی ہے!

دوسرے روز اسی وقت جاگیردار کا بیٹا ہولے ہولے قدم اٹھاتا گھومتی ہوئی پگڈنڈی سے اترا اور جب آگے بڑھا تو اس نے دیکھا کہ رانی ایک چٹان سے سر پھوڑے مری پڑی ہے۔ خشک لکڑیوں کا گٹھا پاس دھرا ہے اور کالا انگوٹھا رات کی ٹھنڈ میں یوں اکڑ گیا ہے جیسے لپک کر نوجوان کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ لگا دے گا۔

* * *

www.iqbalkalmati.blogspot.com

پاؤں کا کانٹا

پاؤں سے کانٹا نکالتے ہوئے ننھے کریم کی چیخ نکل گئی۔ وہ ایڑی کو دونوں ہتھیلیوں میں دباتے ہوئے پکارا "ہائے اماں!" وہ مبہوت و ساکت بیٹھ گیا اور سامنے ویران کھیتوں پر نگاہیں گاڑ دیں۔یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ اپنی ماں کی آواز کا منتظر تھا۔ "میرے انمول لال! میں آئی' میں ابھی کانٹا نکالے دیتی ہوں!" —— اس کے سر پر سے ایک کوا کائیں کائیں کرتا ہوا گزرا اور لڑکھڑاتا ہوا ایک جھاڑی میں جا گرا۔ کریم بھول گیا کہ اس کے پاؤں میں کانٹا ہے۔ وہ لنگڑاتا ہوا بھاگا۔ کوے کو پکڑ لیا۔ وہ اپنے پروں کو پھڑپھڑانے لگا۔ اڑنے کی کوشش کی مگر اس کا داہنا بازو زخمی ہوچکا تھا۔ کریم نے زمین سے مٹی اٹھا کر اس کے زخم پر چھڑکی' دوچار ٹھنڈی سانسیں دیں۔ کوے کو آرام پہنچا تو کھلی ہوئی چونچ بند کر لی اور آنکھوں میں وحشت کی بجائے اطمینان جھلکنے لگا۔ کریم نے بہت سے پتے اکٹھے کرکے سب سے بڑے نیم کی سب سے اونچی چوٹی پر جمائے۔ کوے کو ایک دوبار تھپک کر وہاں بٹھا دیا اور گھر کو لوٹ آیا۔ اس مصروفیت میں اس کے پاؤں کے درد میں نمایاں کمی آگئی تھی۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

وہ ایک کسان کا اکلوتا بیٹا تھا۔ ایک سال ہوا اس کی ماں مر گئی۔ اس کے والد نے پچھلے دنوں ایک اور شادی کر لی تھی لیکن اب یہ نئی ماں اس سے عجیب طرح سے پیش آتی تھی۔

"وہ برتن اندر کیوں نہیں رکھا؟"

وہ پکار اٹھتا۔" اندر ہی تو پڑا ہے۔"

وہ اس کے جبڑوں میں گھونسا جماتے ہوئے کہتی۔ "تو مجھے بتایا کیوں نہیں؟"

وہ چیخ کر کہتا۔ "بتایا تو تھا میں نے!"

کریم نے کئی بار محسوس کیا کہ گھونسے کے زور سے اس کا دل رک گیا ہے لیکن وہ کمبخت اچانک پھر دھڑک اٹھتا اور وہ سہمی ہوئی نظروں سے ایک اور گھونسا سر پر منڈلاتے ہوئے دیکھتا۔ اول اول تو اس نے سوتیلی ماں کے خلاف صدائے احتجاج بھی بلند کی۔ "چھوڑ دے۔ چھوڑے دے مجھے۔ ورنہ میری امی تیری بوٹیاں نوچ لے گی' چھوڑ دے مجھے ورنہ میرا ابا تجھے مار ڈالے گا۔" لیکن ایک دن جب اس کی سوتیلی ماں نے یہ کہا کہ "تیری ماں کو تو قبر میں سانپ اور بچھو چمٹے پڑے ہوں گے' وہ تیرے باپ کا گھر تباہ کر کے اگلے جہان میں آرام سے تھوڑا رہے گی!" تو کریم غصے سے بے بس ہو کر اس پر جھپٹا مگر دھکا کھا کر اوندھے منہ جا گرا۔ دوڑا دوڑا باپ کے پاس گیا اور چیخنے لگا۔ "ابا' خالہ نے میرے دانت توڑ دیئے۔ یہ دیکھو تو مسوڑھوں سے خون بہہ رہا ہے۔ یہ دیکھو ابا میری کہنیاں چھل گئیں۔ وہ کہتی ہے تیری ماں کو سانپ' بچھو کھا رہے ہیں۔ وہ جھوٹ بکتی ہے ابا۔ میری ماں ہر رات آ کر میرا ماتھا چوم........"

تراخ کی آواز آئی اور پھر کریم کا کان اس کے باپ کی انگلیوں میں تھا۔ وہ کان کو اینٹھتے ہوئے بولا۔ "خالہ کے خلاف بک رہا ہے۔ اب تیری ماں کا راج نہیں رہا کہ گھر کا غلہ نکال کر دکانداروں کے آگے جا ڈالے اور گھر سے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اڑائے' اب انسانوں کی طرح رہنا پڑے گا یہاں!"

اس دن کے بعد اس نے باپ کے آگے کوئی شکایت نہ کی' نہ اپنی خالہ کے گھونسوں کا جواب کسی دھمکی سے دیا۔ بس چپ چپ گھونسے سہ لیتا اور اپنی ٹوٹی پھوٹی کھاٹ پر بازو کا تکیہ بنا کر سو جاتا۔ صبح گھونسے سہ کر باہر جاتا۔ مویشی چرا کر لاتا اور گھونسے سہ کر سو جاتا۔

اس دن وہ ایک بیل کے پیچھے بھاگا تو اس کی ایڑی میں کوئی بہت لمبا کانٹا چبھ گیا۔ زخمی کوے کو گھونسلے میں بیٹھا کر گھر آیا اور اپنی ٹوٹی پھوٹی کھاٹ پر لیٹ گیا جو صحن کے پرلے سرے پر بیلوں کے تھانوں کے پاس دن رات پڑی رہتی تھی۔ کھاٹ کیا تھی ایک جھولا تھ جس میں ننھا کریم گھٹنے سینے سے لگائے' بازو جسم سے چمٹائے پڑا رہتا تھا۔

اس کی خالہ چولہے کے سامنے بیٹھی تھی اور اس کا باپ پاس ہی ایک پلنگ پر لیٹا حقہ پی رہا تھا۔ اس کی خالہ کہنے لگی۔ "ابھی تک کریم نہیں آیا' جانے گاؤں میں کیا کرتا رہتا ہے۔ پرسوں کی بات ہے ہمسائی کے ہاں گیا اور کہنے لگا۔ "مجھے میری نئی ماں مارتی ہے' روٹی نہیں دیتی۔ میں بھوکا ہوں۔ میں ننگا ہوں۔" اب اس سے پوچھو میں نے اسے کب مارا۔ میں نے اسے کب کھانا نہیں دیا۔ کب کپڑے نہیں پہنائے۔ اس بچے کو کچھ سمجھاؤ ورنہ یہ گھر گھر کھانے کو مانگتا پھرے گا' اور تم شریکوں کے سامنے سر نہ اٹھا سکو گے۔"

اس تقریر کے دوران کریم نے ایک دو بار آواز دی۔ "میں آ گیا ہوں ابا' میں آ گیا ہوں۔" لیکن نہ اس کے باپ نے کچھ سنا نہ اس کی خالہ نے۔ جب وہ سانس لینے کے لیے رکی تو کریم ان کے قریب آیا اور بولا۔ "میں تو کب کا بیٹھا ہوں خالہ۔"

اس کا باپ حقہ ایک طرف کر کے اس کی طرف بڑھا۔ "کیوں بے! تیری ماں کیا مری کہ تو ہر بندھن سے آزاد ہو گیا۔ گھر گھر میرے گلے ہو رہے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہیں۔" ایک تھپڑ کریم کے منہ پر پڑا۔ اس کے جی میں آئی کہ باپ کے اس ظلم کے خلاف احتجاج کرے مگر زبان بے حس ہو کر رہ گئی۔ وہ چپ چاپ اٹھا اور اپنی کھاٹ کا رخ کیا۔

"آج لنگڑا کیوں رہا ہے۔" اس کے باپ نے پوچھا۔

"کانٹا چبھ گیا تھا جی۔" کریم نے دردناک لہجے میں جواب دیا۔ آخری الفاظ کہتے ہوئے اس کی آواز کانپ گئی۔

اس کا باپ گرجنے لگا۔ "کانٹا چبھ گیا امیر زادے کے ——— آفت آگئی۔ اور لنگڑا یوں رہا ہے' جیسے کسی نے پاؤں ہی اڑا دیا ہے۔ ادھر آ' سوئی لے کر دیئے کے پاس بیٹھ جا اور نکال اسے۔"

کریم اندر جا کر سوئی لے آیا۔ دیئے کے پاس بیٹھ کر ایڑی اٹھائی اور سوئی سے کانٹے کے اردگرد کی کھال کریدنے لگا۔

رہ رہ کر اسے اپنی ماں یاد آرہی تھی جو اسے ہاتھوں پر اٹھائے رکھتی تھی۔ جو اس کے لیے قسم قسم کی چیزیں خرید لاتی تھی۔ کھانے کی چیزیں' پہننے کی چیزیں۔ جس نے اپنی پڑوسن کو جو ایک دن کریم کے پاؤں سے کانٹا نکال رہی تھی' کہا تھا۔ "اری ذرا دھیرے سوئی پھیر۔ بس یہ سمجھ تو میرے کلیجے پر سوئی پھیر رہی ہے!"

کریم کو یہ بات یاد آئی تو اس کی چیخ نکل گئی۔ اس کا باپ صحن کے پرلے سرے پر بیلوں کے آگے گھاس ڈال رہا تھا۔ اس کی خالہ اٹھی اور اس کے پاس آکر کہنے لگی۔ "کیوں بے لونڈے' رو کیوں رہا ہے' سانپ نے ڈس لیا ہے کیا؟"

اس نے حسرت بھری نگاہیں اٹھائیں اور خالہ کی گھورتی ہوئی آنکھوں میں گاڑ دیں۔

اس کی خالہ نے اس کی گردن پر غصے سے الٹا ہاتھ مارا۔ کریم ڈیوٹ پر

www.iqbalkalmati.blogspot.com

جا گرا۔ دیا لڑھک کر اس کی گود میں آ رہا۔ اس کے کپڑوں کو آگ لگ گئی۔ لہراتے ہوئے شعلوں سے چیخوں کا ایک طوفان بلند ہوا۔ "ابا' دوڑیو" میرے ابا' میں جل رہا ہوں' ہو ابا۔"

اس کا باپ ہوا کی طرح اس کے پاس پہنچا۔ گھڑے پر گھڑا انڈیلنا شروع کر دیا۔ آگ بجھ گئی اور اب زمین پر کیچڑ میں لت پت بیہوش کریم آہستہ آہستہ سانس لے رہا تھا۔ سارا محلّہ اکٹھا ہو گیا۔ لالٹین جلائی گئی۔ کریم کا داہنا بازو' داہنی ران اور داہنی پسلیاں بری طرح جل چکی تھیں۔ کھال اڑ چکی تھی۔ اور نیچے سفید چربی چمک رہی تھی۔ اسے چارپائی پر لٹا دیا گیا۔ حکیم جی نے زخموں پر مکھن ملنے کو کہا اور سب لوگ چلے گئے!

اب اس کے باپ کا دل پسیجا۔ اسے اپنی بیوی کی مغموم روح سامنے منڈیر پر اپنا چہرہ ہتھیلیوں میں سنبھالے بیٹھی آنسو گراتی نظر آئی۔ اس کی نگاہیں اپنے جلے ہوئی بیہوش بچے پر گڑی ہوئی تھیں۔ پھر اس نے تاروں کی طرف اڑتے ہوئے ایک سمت اشارہ کیا۔ کریم کا باپ سب کچھ سمجھ گیا۔ اسے وہ دن یاد آگیا جب شہر کے باہر بوڑھے نیم کی ٹیڑھی شاخوں کے گھنے سائے میں ان دونوں نے اپنے والدین کی باہمی دشمنی سے بے پروا ہو کر ہمیشہ کے لیے ایک ہونے کا عہد کیا تھا! اس کے روئیں روئیں سے پسینہ پھوٹ نکلا۔ اس کا سارا جسم سو گیا۔ وہ غیر ارادی طور پر اپنے بچے کی طرف بڑھا' جس نے اب آنکھیں کھول دی تھیں اور جس کی سوتیلی ماں روٹی پر گھی ڈال کر کھا رہی تھی۔ وہ کریم کے قریب گیا۔ ماتھے پر ہاتھ پھیر کر پوچھا۔ "میرے کریم کہاں کہاں درد ہے تمہارے؟ تمہارے کہاں کہاں درد ہے؟ بتاؤ نا' مجھے بتاؤ کہ وہاں میں اپنے کلیجے کا خون نچوڑ دوں۔ تم مجھے گھور کیوں رہے ہو' میرے بچے تم مجھے اس طرح نہ دیکھو' میرے ننھے اس طرح تمہارے کمینے باپ کی روح میں نشتر گڑ جاتے ہیں۔ کہاں کہاں درد ہے تمہارے؟ بتاؤ نا؟!"

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"ایڑی پر ابا۔" ایک نحیف آواز آئی۔ "وہاں کانٹا چبھ گیا تھا۔"

کریم کا باپ کلیجہ پکڑ کر رہ گیا۔ ابھی تک کریم کو اپنے جلنے کی خبر نہیں تھی۔ وہ بولے جا رہا تھا۔ "ابا یہاں ایڑی میں اتنا لمبا کانٹا چبھ گیا' خالہ' ذرا سوئی دینا' میں کانٹا نکال لوں۔"

کریم کا باپ شدت درد سے بلبلا اٹھا۔ "ہائے میرے بچے' میرے کریم' تم تو جل گئے ہو' تمہیں معلوم نہیں کیا؟ اللہ تمہیں اچھا کر دے' بہت جلد اچھا کر دے۔ میں اپنے کریم کے لیے اتنی چیزیں لاؤں گا۔ اتنی چیزیں لاؤں گا کہ میرا کریم انہیں اٹھا تک نہ سکے گا۔"

کریم کو اب آہستہ آہستہ اپنے جلنے کا احساس ہو رہا تھا۔ اس کا باپ اس کی رنگت کی تبدیلی دیکھ کر ہراساں ہو گیا' پکارا۔ "اری لانا ذرا' کھانڈ لانا' کریم کے منہ میں ڈالوں' یہ تو پیلا پڑ رہا ہے۔"

وہ گھی میں لقمہ بھگو کر بولی۔ "اچھا ہو جائے گا۔ بچے جلتے ہی رہتے ہیں اکثر۔ تم پر تو جیسے قیامت ٹوٹ پڑی ہے۔ اچھا ہو جائے گا کمبخت' تم کیوں اپنی جان ہلکان کرتے ہو۔ ادھر کھانا کھا لو' پراٹھے ٹھنڈے........!"

کسان کے بھاری جوتے نے اسے آگے بڑھنے کی مہلت نہ دی۔ لقمہ اس کے منہ سے نکل کر فرش پر جا گرا۔ اس کی کھوپڑی تڑا تڑ جوتے کھانے لگی۔ اس نے سارا محلہ سر پر اٹھا لیا۔ لوگ جمع ہو گئے۔ اسے خاموش کرایا۔ کسان کو ضبط کرنے کی تلقین کی اور چلے گئے۔ کریم اب چارپائی پر بل کھا رہا تھا۔ گوشت کے ننھے ننھے پرزے آپ سے آپ گر رہے تھے' ساری رات اس کا باپ اس کے سرہانے بیٹھا رہا۔

صبح ہوئی تو کریم نے باپ کے گھٹنے سے سر اٹھاتے ہوئے کہا۔ "ابا تم مجھے اب مارو گے تو نہیں؟" کسان کی آنکھوں سے آنسوؤں کے چشمے پھوٹ بہے۔ اس نے انتہائی ضبط سے کہا۔ "نہیں بیٹا۔" کریم بولا۔ "تو ابا ایک کام

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کرو۔ گاؤں کی پوربی چراگاہ کے اتری کونے پر نیم کے درختوں کا ایک جھنڈ ہے
نا؟ سب سے بڑے نیم کی سب سے اونچی ٹہنی پر ایک کوے کا گھونسلہ ہے۔
اسے جا کر کچھ پانی اور دانے ڈال آؤ۔ جاؤ گے؟"

"ابھی جاتا ہوں۔" کریم کے باپ نے جواب دیا۔ لیکن وہ کریم کی ان
بے سروپا باتوں کو بیہوشی پر محمول کرنے لگا۔ کچھ دیر کے بعد کریم نے آنکھیں
کھولتے ہوئے پھر کہا۔ "کیا نہیں جاؤ گے ابا؟"

"ابھی جاتا ہوں میرے بچے۔" کریم کا باپ یہ کہہ کر اٹھا۔ پانی کے
لیے مٹی کا ایک چھوٹا سا پیالہ لیا۔ دانے مٹھی میں ڈال کر گاؤں کی مشرقی چراگاہ
کی طرف گیا۔ بڑے نیم کی اونچی ٹہنی پر ایک کوا گھونسلے سے پر نکالے کائیں
کائیں کر رہا تھا۔ وہ اوپر چڑھا کوے کے پاس پانی رکھ دیا۔ دانے بکھیر دیئے۔
کوے کو اٹھا کر دیکھا۔ اس کا ایک بازو بری طرح زخمی تھا۔ وہ یہ معمہ نہ سمجھا۔
اس کا دماغ گھومنے لگا۔ واپس ہوتے وقت ایک شخص نے اس سے پوچھا۔
"کہاں گئے تھے آپ؟" اس نے جواب دیا۔ "رات کو۔ رات کو جلا۔ بس دیئے
نے کپڑوں کو آگ لگا دی' اور جسم کا دایاں حصہ گل گیا!" پوچھنے والا شخص
متعجب اور شرمندہ ہو کر ایک گلی میں مڑ گیا۔

کریم کا باپ اپنے بیٹے کے پاس آیا۔ جھک کر پوچھا۔ "جاگ رہے ہو
بیٹا؟"

"جاگ رہا ہوں ابا' کوے کا کیا حال ہے؟"

"اچھا تھا میرے بچے۔ تمہیں سلام کہتا تھا۔"

کریم نے ہنسنے کی کوشش کی۔ "تو میں خود اسے سلام کا جواب دوں گا
ابا۔ اب ذرا بیل کھول دو' باہر جانے کا وقت ہو گیا ہے!"

کسان ضبط نہ کر سکا' بے اختیار رونے لگا۔ اپنی نئی بیاہی ہوئی بیوی کی
طرف دیکھا جو ایک کونے میں بیٹھی اسے بے انتہا نفرت سے گھور رہی تھی۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اسے وہ دن یاد آ گئے۔ جب بیلوں کے لیے ایک علیحدہ ملازم ہوتا تھا اور پھر جب کریم کی ماں چل بسی' تو ملازم نکال دیا گیا اور بیل کریم کے آگے لگا دیئے گئے۔ اسے اپنی ساری زندگی پر اندھیرا ہی اندھیرا چھایا ہوا دکھائی دینے لگا۔ وہ دل ہی دل میں اپنے آپ کو ملامت کرنے لگا کہ وقتی مسرتوں کے سیلاب میں اس کی اولین محبت اور خاندانی غیرت کا فولادی قلعہ جڑ سے اکھڑ کر بہ گیا تھا!

وہ روز صبح شام کوے کے لیے دانہ پانی لے جاتا اور پھر کریم کے پاس بیٹھا رہتا۔کوئی تیماردار آتا تو اسے کہتا۔ "بلا ناغہ صبح حکیم جی آتے ہیں' دوا لگا جاتے ہیں' لیکن کریم کی حالت گرتی ہی جاتی ہے۔ حکیم جی کہتے ہیں کہ روزانہ کوئی اس کے زخموں کو چھیڑ دیتا ہے۔"

تیماردار کہتا۔ "کروٹ بدلنے سے کچے زخم چھل جاتے ہوں گے۔"

مگر اس کی تسلی نہ ہوتی!

کریم کی حالت روز بروز ابتر ہوتی گئی اور آخر ایک دن ایسا آیا کہ کریم صبح کو بیہوش ہوا تو دوپہر تک اس کی آنکھیں نہ کھلیں۔ اس کا باپ دیوانوں کی طرح ایک جگہ سے دوسری جگہ بیٹھتا۔ بے مطلب بغیر کسی کام کے۔ اس نے سر کو زانو پر رکھا۔ پیچھے دیوار سے سہارا لیکر بیٹھنا چاہا۔ پاؤں پسار دیئے۔ گھٹنے سکیڑ لیے' لیکن اس کے اندر غم و اندوہ اور پشیمانیوں کا دوزخ دہک رہا تھا۔ اسے ایک لمحہ بھی سکون میسر نہ آسکا' اور اس کی بیوی مکان کے ایک کونے میں بیٹھ کر انگریزی صابن سے ہاتھ منہ اور پاؤں دھوتی رہی۔

دوپہر کو کریم نے آنکھیں کھولیں۔ حکیم جی پاس بیٹھے تھے۔ انہوں نے پکار کر کہا۔ "ملک جی بچہ ہوش میں آگیا۔" کریم کا باپ دوڑا آیا' کریم کی پیشانی کو اس نے اتنی محبت سے چوما کہ آس پاس کھڑی عورتوں کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔ اس نے پوچھا۔ "کریم بیٹا' کیا حال ہے اب؟ طبیعت کیسی ہے؟ درد کہاں ہے؟"

جواب ملا۔ "ایڑی میں ابا' ایڑی میں درد ہے۔ ایک لمبا سا کانٹا چبھ گیا وہاں۔"

آئینہ دیکھتی ہوئی سوتیلی ماں کانپ اٹھی۔ کریم کا باپ بولا۔ "بیٹا' کل تمہارا کوا پر تول رہا تھا' مجھے ڈر ہے وہ اڑ نہ جائے۔"

کریم بولا۔ "تو ابا! آج آخری بار اسے دانے ضرور ڈال آؤ۔"

حکیم جی نے کہا۔ "اب بچے کی حالت اچھی ہے۔" سب لوگ اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔ کریم کے باپ نے اپنی بیوی کو کریم کی دیکھ بھال کی تاکید کی اور مٹھی میں دانے دبائے کوے کے گھونسلے کی طرف بھاگا۔

وہ گلیوں میں بگولے کی طرح اڑا جا رہا تھا۔ چراگاہ میں اس کے پاؤں ہوا میں تھرکتے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ راہرو اسے اس ہیئت میں دیکھ کر دانتوں تلے انگلی دبا لیتے تھے۔ سورج آسمان کے سینے میں دہک رہا تھا۔ ڈھیریوں پر بھیڑیں' بکریاں اور بیل گردنیں جھکائے چر رہے تھے۔ نیم کے جھنڈ سر جھکائے کھڑے تھے —— ساری کائنات اونگھ رہی تھی!

کریم کا باپ تیزی سے بڑے نیم پر چڑھا۔ گھونسلے کے پاس پہنچا ہی تھا کہ کوا "پھرررر" کی آواز پیدا کرتا گھونسلے سے باہر نکلا اور چراگاہ پر سے اڑتا' کھیتوں پر سے تیرتا' ڈھیریوں پر سے لپکتا ہوا لرزتے ہوئے افق میں غائب ہو گیا۔

اس کے حواس معطل ہو گئے۔ وہ ٹہنیوں سے لٹک کر نیچے آ رہا۔ پوری قوت سے گھر کی طرف بھاگا اور دروازے میں داخل ہوتے ہوئے بولا۔ "بیٹا کریم وہ کوا تو اڑ گیا!"

کریم کے لبوں پر ہنسی کھیل رہی تھی جیسے وہ اپنے باپ کے جنون کا مضحکہ اڑا رہا ہے!

حکیم جی آئے۔ انہوں نے کریم کی نبضیں ٹٹول کر کہا۔ "آج اس کے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

زخموں کو کسی نے بیحد سختی سے چھیلا ہے' اسی لیے جانبر نہ ہو سکا۔ آپ کے گھر میں کون تھا ملک کی؟"

نئی بیوی کے ہاتھ سے لقمہ گر کر پانی کے برتن میں جا گرا۔

کریم کا باپ کپڑے پھاڑتا ہوا باہر نکل گیا۔ "لوگو! میرے بچے کی ایڑی میں کانٹا چبھ گیا ہے' اسے نکالو۔ نیم کے درختوں میں ایک کوا رہتا تھا۔ وہ آج پربت سے پرے اڑ گیا۔ اس کو پکڑ لاؤ۔ میری بیوی نے میرے بچے کے زخم چھیل دیئے ان پر پھاہا رکھو۔ ـــــ لوگو ـــــ لوگو!! ـــــ تم میرا منہ کیا تک رہے ہو!"

❋ ❋ ❋

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ان بن

جانے کیا بات ہوئی کہ میاں بیوی الجھ پڑے' اور الجھے بھی ایسے کہ دونوں نے ایک دوسرے سے بات نہ کی۔ جس گھر میں قہقہوں کی گونج سے پڑوسیوں کو شکایت پیدا ہو چکی تھی اس پر مرگھٹ کا سکوت چھایا رہتا۔ اور جو کوئی بھولے سے پوچھ بیٹھتا کہ آخر اس نرالی چپ کا مدعا کیا ہے' تو حامد خاں لال لال آنکھیں یوں گھماتا اور جھپکاتا جیسے جھپٹ کے دبوچ لے گا اسے! اور کوئی اگر منہ پھٹ بڑھیا جی کڑا کر کے سلیمہ رانی سے اس غیر معمولی سنجیدگی کی وجہ دریافت کر بیٹھتی تو وہ یوں نتھنے پھڑکاتی اور ہونٹ کاٹتی کہ بڑھیا کو کھسک نکلنے کے سوا اور کچھ نہ بن پڑتا۔

حامد اور سلیمہ کا جوڑا گاؤں بھر میں اپنی مثال آپ تھا۔ شادی سے قبل حامد کے متعلق مشہور تھا کہ خوبصورت اور تنومند جوان سہی' لیکن ایسا بددماغ ہے کہ ہلکے سے مذاق سے تڑپ اٹھتا ہے۔ جو لڑکی اس کی قسمت میں آئی اس سے شاید ہی بن سکے۔ ہفتہ دس دن کے بعد بھاگ نکلے گی۔ اور عمر بھر حامد میاں ایڑیاں رگڑتے گزار دیں گے۔

سلیمہ کے متعلق مشہور تھا۔ کہ وہ شاید ہی گاؤں میں کسی لڑکے کو پسند کرے گی۔ اس کے انداز میں ایسا غرور اور اس کی چال ڈھال میں ایسا طنطنہ تھا کہ اچھے اچھے کشادہ سینوں والے جہاندیدہ گبھرو پھڑک گئے اور دانتوں میں انگلی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

داب کر بولے۔ "اسے کون بلائے! شعلہ بن کر گرے گی۔ چاٹ لے گی بجلی کی زبان بن کر!" ——— جدھر سے گزرتی ایک سکوت چھا جاتا۔ جہاں بیٹھتی یوں معلوم ہوتا جیسے سارے جہان کی ملکہ ہے! چنوں کی دال اور مکی کی موٹی پیلی روٹی کھانے والی سلیمہ ایسی نازک اندام تھی کہ گمان ہوتا تھا جیسے ابھی ابھی پھولوں کی سیج پر سے کچی نیند میں اٹھ کر آئی ہے۔ شادی کے دن تک اس سے کسی من چلے نے بات نہ کی۔ ایک بار ایک افواہ ضرور مشہور ہوئی کہ دلاور خاں پنگھٹ کے تنگ موڑ پر چھپ کر بیٹھ گیا اور غلیل میں کنکر رکھ کر سلیمہ کی چھلکتی ہوئی گاگر کو یوں تاک کر نشانہ بنایا کہ گول سوراخ سے پانی بہہ کر اس کے دوپٹے' بالوں اور سینے پر سے ہوتا ہوا اس کی ایڑیوں پر پڑنے لگا۔ آس پاس پنہاریاں ایسی مغرور چھوکری کی یہ درگت دیکھ کر گنگنانے لگیں اور سلیمہ یوں پھنک گئی جیسے بس چلے تو نشانہ باز کو دنیا جہان کے کنکروں سے روئی کی طرح دھنک کر رکھ دے۔ وہ تو خیر ہوئی کہ دلاور خاں پاس ہی ایک شہتوت کے تنے کی اوٹ میں ہو گیا۔ ورنہ کیا جانے سلیمہ کیا گل کھلا بیٹھتی!

حامد کا باپ فوج کا پنشنر سپاہی تھا۔ ملازمت کے زمانے میں اس نے کہیں سے سن لیا تھا کہ شہروں میں مردوں کے نام حامد اور لڑکیوں کے نام سلیمہ رکھے جاتے ہیں۔ چھٹی پر گھر آیا تو اپنے لڑکے رکھایا کا نام حامد اور اپنے دوست کی لڑکی جوائی کا نام سلیمہ رکھ دیا۔ بڑے بوڑھوں نے بھنا کر کہا۔ "فرنگی سے دو باتیں کیا کر لیں' سارے جہان کی گردن مار آیا ہے۔ ایسے نام رکھے ہیں جیسے چغتے خاندان میں سے ہے۔ یہ نہیں سوچتا کہ جب حامد میاں کی مٹھی میں ہل کی ہتھی ہوگی اور ہونٹوں پر نخ نخ! اور سلیمہ کے سر پر چھاچھ کی ٹھلیا اور باجرے کی پانچ سیری روٹی ہوگی اور گلے میں بوری ایسے کھدر کا کئی جگہ سے مسکا ہوا چولا' تو ناموں کی ساری شیخی کرکری ہو جائے گی!" ——— لیکن جب حامد اور سلیمہ کے ماں باپ انہیں ان پیارے ناموں سے پکارتے تو ان کے کلیجے ٹھنڈے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہوتے۔ حامد کا باپ ہنس ہنس کر کہتا۔ "ارے رکھایا بھی کیا نام ہوا۔ کیا ہم خاکروب ہیں! ہم بافندے ہیں کیا! بیس پچیس بھیگے زمین کے مالک اور نام رکھایا!
—— اونہہ!" سلیمہ کی ماں اپنے جھریوں پڑے ہونٹوں پر مسکراہٹ لاتے ہوئے پکارتی —— "اے سلیمہ —— اے سلیمہ رانی۔ اے واہ وا' کیا میٹھا نام ہے۔ جوائی' اور بھرائی اور پھرائی بھی کوئی نام ہیں۔ یہ تو گالیاں ہیں گالیاں
——اے سلیمہ بیٹی ادھر سرپوش میں سے میری نسوار کی ڈبیہ اٹھا دے۔ اے سلیمہ رانی!" —— پڑوسی بڑھیا کی یہ باتیں سن سن کر کڑھتے اور اِدھر یہ بلند قہقہے لگاتے اُدھر حامد کا باپ انہیں شہروں کی باتیں سناتا۔ اس کے بعد عجیب عجیب ناموں کے تذکرے شروع ہوتے —— سکندر حیات شمس الہدیٰ۔ غضنفر علی اور فرخندہ بیگم۔ عشرت۔ سلطان۔ بلقیس جمال —— اور پھر ایک طرف سے سلیمہ کا ننھا بھائی کہتا —— "اور نظام حیدر آباد!" —— اور حامد کا باپ لمبے لمبے قہقہوں کے درمیان جھک جھک کر کہتا "ارے بھولے بادشاہ نظام حیدر آباد نام نہیں۔ یہ تو بابر بادشاہ کے ایک افسر کا لقب تھا!" —— اور اس طرح ان دو غریب گھروں میں ہر وقت قہقہے مچلتے رہتے!

اور شادی کے ڈیڑھ دو مہینے بعد اچانک حامد اور سلیمہ میں کسی بات پر جھڑپ ہو گئی۔ اور جھڑپ بھی ایسی ہوئی کہ دم سادھ کر بیٹھ گئے۔ سلیمہ کھانا پکا کر حامد کے آگے رکھ دیتی۔ حامد کھانا کھا کر پرے ہٹ کر بیٹھ جاتا۔ پھر ادھر حامد انگلیاں چٹخاتا رہتا۔ ادھر سلیمہ سوئی سے ناخنوں کو کریدتی رہتی اور یوں ہی شام ہو جاتی۔ کبھی کبھی کوئی بھولی چمگادڑ اندھیرے میں دیوار سے ٹکرا کر پھڑپھڑاتی تو وہ آنکھیں ملنے اور انگڑائیاں لینے لگتے۔ ورنہ کئی بار تو ایسا ہوا کہ وہ جہاں بیٹھے ہیں سو گئے اور جہاں سوئے ہیں' وہیں سے صبح کو اٹھے ہیں!

ایک روز حامد کی ماں لاٹھی ٹیکتی ان کے گھر آئی اور آتے ہی بولی۔
"بیٹا۔ سنا ہے تم دونوں ایک دوسرے سے روٹھ گئے ہو۔ واری جاؤں اگر میں یہ

www.iqbalkalmati.blogspot.com

جانتی کہ تم دونوں میں یوں چل جائے گی تو میں تمہیں اپنے پاس ہی سے نہ جانے دیتی۔ میں نے تو یہ مکان اس لیے تمہارے حوالے کیا تھا کہ تمہیں اپنا الگ گھر آباد کرنے کا خیال پیدا ہو۔ ابھی مجھ نگوڑی کے ذمہ تمہارے تین بھائیوں کا بیاہ ہے۔ لیکن تم ہو کہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہو اور کل تمہارا باپ گلی میں اکیلے رسی بٹتا رہا۔ کسی نے پوچھا۔ تیرے بیٹے کیا ہوئے جواب دیا کہ تین کھیت میں ہیں اور حامد کچھ بیمار ہے' اور یہ کہہ کر بے چارے کے آنسو نکل آئے۔ آنسو پونچھتا رہا اور اکیلے رسی بٹتا رہا۔ بیچارہ رو رہا تھا مارے دکھ کے کہتا تھا جوان اولاد کا کوئی سکھ نہ دیکھا۔ حامد کو کیا بیاہا' اپنا ایک کھلنڈرا بیٹا کھو دیا۔ سلیمہ رانی آخر بات کیا ہوئی؟ تو تو موم کی مورت بنی بیٹھی رہتی ہے۔ نئی نویلی دلہن اللہ کرے کبھی پیلی نہ پڑے۔ اے تیرا سہاگ صدیوں قائم رہے۔ تو کیوں یوں چپ چاپ بیٹھی زمین کو گھورے جا رہی ہو؟ اے حامد بیٹا تو ہی کچھ بتا دے۔ مجھ نگوڑی بڑھیا سے اتنا کھڑا نہیں رہا جا سکتا۔ اے مجھ اللہ ماری کو کچھ بتا دے ــــــــ!"

اور حامد بھرائی ہوئی آواز میں دونوں ہاتھ بلند کرتے ہوئے پکارا۔

بس بس ماں تم کچھ نہ پوچھو' کوئی بات نہیں ہوئی۔ یونہی طبیعت اداس ہو گئی!"

اور بڑھیا دیوار سے سہارا لے کر بولی۔ "تیری تو طبیعت اداس ہوئی۔ لیکن آخر میری سلیمہ رانی کو کیا ہوا؟"

"یہ اپنی سلیمہ رانی سے پوچھیے؟"

"ہے سلیمہ۔" بڑھیا سلیمہ کی طرف متوجہ ہوئی!

اور سلیمہ کے گال گلابی پڑ گئے۔ آنکھوں کے چاروں طرف چمکتے آنسوؤں کی لہریں ابھریں اور اس کی سیاہ پتلیوں کو ڈھانپ لیا۔ وہ بلکنے اور چیخنے لگی اور ڈھلکا ہوا دوپٹہ سر پر بھونڈے انداز میں پھیلاتی' جوتے گھسیٹتی اٹھی اور گھر سے باہر نکل گئی ــــــــ ابھری ہوئی منڈیر پر چڑا اپنے ننھے سے سر کو طنزاً" نچاتا ہوا بولا۔ "چرچر۔ چیں چیں!" ــــــــ اور ماں بیٹا یوں دم بخود رہ

گئے جیسے بیٹھے بیٹھے اچانک ان کے سروں پر آسماں پھٹ پڑا!

حامد کی ماں فرش پر بیٹھ کر رونے لگی اور حامد ایک طرف مڑ کر نئی لپی ہوئی کچی دیوار میں سے بھوسے کے تنکے کریدنے لگا۔ پڑوسن بارش کے انتظار میں چھت پر جھاڑو پھیر رہی تھی۔ ماں بیٹے کو یوں اداس دیکھا تو جھاڑو پھٹکاتی منڈیر پر آگئی اور ناک پر انگلی رکھ کر بولی۔ "ہے نور بھری' ہے تیرے بچے جئیں ——کیوں بیٹھی دشمنوں کو رو رہی ہے!"

بڑھیا اپنی لاٹھی پر بیتابانہ انگلیاں گھماتی ہوئی بولی۔ "ہے بہن۔ میں نصیبوں جلی اپنے لیکھ کو بیٹھی رو رہی ہوں۔ مجھ نگوڑی کے سکھ پلک مارنے میں دکھ بن جاتے ہیں۔ اتنی عمر بیتی' ابھی مجھ اللہ ماری کا جی کھول کر ہنسنے ہنسانے کا موقع ہی نہ آیا!"

"لیکن آخر بات کیا ہے؟" پڑوسن نے آگے جھکتے ہوئے پوچھا۔ "کیا ہوا آخر؟"

"اے ان میاں بیوی میں کچھ ان بن ہو گئی۔ سلیمہ کو تو جیسا سنتے تھے ویسا پایا۔ میں نے اس ان بن کی وجہ پوچھی تو بلکنے لگی۔ تسلی دینی چاہی تو چھپاک سے باہر نکل گئی۔ موئے زمانے نے کچھ ایسی پھیری لی ہے کہ ان چھوکریوں کی خفگی تو ناک پر بوند بن کر رہ گئی ہے۔ ذرا چھیڑو اور ٹپ سے خاک!——اور ——اے حامد——اے بیٹا تو کیوں نئی دیوار کے پیچھے پڑ گیا ہے۔ دیکھ یوں ناخن کے پیچھے کوئی تنکا چبھ گیا تو اور مشکل بنے گی۔ میں لے آؤں گی سلیمہ کو۔ وہ جا ہی کہاں سکتی ہے؟ میری بہو اور میکے بیٹھی رہے! میں گلیوں میں اپنے آپ پر انگلیاں اٹھتی نہیں دیکھ سکتی۔ میں اسے ابھی لینے جاتی ہوں!"

اور حامد پلٹ کر ماں کا ہاتھ پکڑتے ہوئے بولا۔ "رہنے دے ماں' جانے دے۔ میں تجھے ایسی چھوکری کے گھر جاتا نہیں دیکھ سکتا جو میری بوڑھی ماں کا اتنا لحاظ بھی نہ کرے کہ اٹھ کر چٹائی بچھا دے۔ ہاتھ تھام لے۔ پانی بھر

www.iqbalkalmati.blogspot.com

لائے۔ رانی کی طرح اکڑ کر بیٹھی رہی اور تو نے بات کی تو جیسے ناگن نے ڈس دیا۔ اچھل پڑی اور پھر بچوں کی طرح روتی ہوئی لپک کر گھر سے باہر!——— مجھے جوان لڑکیوں کا یہ وتیرہ پسند نہیں——— میں تیری منت کرتا ہوں' اس کے ہاں نہ جائیو۔ ویسے ہم پر انگلیاں اٹھیں گی۔ اور یوں ہاتھ اٹھنے لگیں گے! ——— رہنے دے!"

اور پڑوسن جھاڑو کی تیلیاں جوڑتی ہوئی منمنائی۔ "نوج صدی نے کچھ ایسا پہلو پلٹا ہے کہ اچھے برے کی تمیز اٹھ گئی۔ میری لڑکی بھی پرسوں سے ساس سے روٹھ آئی ہے۔ اور اب نیچے گھرونچی کے سہارے بیٹھی گیلی مٹی میں لکیریں کھینچ رہی ہے!"

پڑوسن منڈیر سے ہٹ گئی تو حامد ماں کے قریب آیا اور بولا۔ "ماں اصل میں تم عورتیں ذرا سی بات کو اتنا بڑھا کر دکھاتی ہو جیسے بھونچال آگیا۔ میں تو سلیمہ کے ہاں جانے سے رہا اور تم بھی خدا کے لیے ادھر نہ جائیو۔ خود آنکلی تو اس کا گھر ہے۔ ورنہ ہم اس کے تلوے چومتے چاٹتے پھریں!——— یہ نہ ہو سکے گا۔ میں کوئی نکما تھوڑا ہوں۔ آج سے ابا کا ہاتھ بٹاؤں گا!"

لیکن دراصل سلیمہ کے روٹھنے اور پھر اس کے یوں چل دینے سے حامد کے کلیجے پر چھریاں چل گئی تھیں۔ اول تو اس لیے کہ وہ بہت مدت سے سلیمہ کے خیال کو اپنے دل میں بسائے ہوئے تھا اور چھپ چھپ کر جھاڑیوں کی آڑ میں اور منڈیروں کی اوٹ میں اس نے کئی بار سلیمہ کو جی بھر کر دیکھا تھا۔ اسے سلیمہ کی آن بان بہت پسند تھی۔ جب وہ کنوئیں پر سے واپس آتی تو دس بارہ پنہاریوں کے آگے آگے یوں مٹک مٹک کر اور اکڑ اکڑ کر چلتی' جیسے کوئی شہزادی اپنی سہیلیوں اور بھنوں سمیت پائیں باغ میں چہل قدمی کرنے کو نکلی ہے۔ اور حامد نے جب اپنے اور سلیمہ کے رشتے کے متعلق سنا تو لوگوں نے دیکھا کہ اس روز وہ بیحد مغموم رہا اور اس کا رنگ غصے سے سرخ ہو گیا اور وہ

www.iqbalkalmati.blogspot.com

پریشانی میں ایک جگہ جم کر نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ مگر یہ ان کی بھول تھی۔ اس کے سینے میں آنے والی خوشیوں نے کچھ ایسا طوفان مچا دیا تھا کہ اسے بہت مدت تک راتوں کو نیند نہ آئی اور دنوں کو چین نہ مل سکا اور اب جبکہ سلیمہ اسی کی ہو گئی تھی' اس نے بہت قریب سے اس کی گہری کالی آنکھیں' لانبے ملائم بال' انار کی شگفتہ کلی کی سی رنگت اور نیم کی نودمیدہ ڈالی کی سی لچک دیکھی تھی اور وہ سلیمہ کی دھن میں یوں کھو گیا کہ اس کا باپ اکیلا گلیوں میں رسیاں بٹتا پھرا' اس کے بھائی تن تنہا زمینوں میں ہل چلاتے رہے اور اس کے دل میں ایک ذرا سی الجھن بھی نہ ہوئی۔

اور پھر وہ اپنے ہمجولیوں میں استہزا کا نشانہ بننے سے مر جانے کو کئی درجہ افضل سمجھتا ہے۔ کیونکہ وہ کسی کی ذرا سی کڑوی بات پر بھی ناک بھوں چڑھا لینے کا عادی تھا اور اب تو اسے ایسی کیلی باتیں سننے کا خوف تھا کہ اس نے کئی بار نئی کڑاہی کے تیز کنارے سے ماتھا پھوڑ لینے کے خیال پر غور کیا!

حامد کی ماں آنسو پونچھتی ناک سڑسڑاتی اور کھانستی باہر جانے لگی تو یہ کہتی گئی۔ "میں تیرے ابا کو بھیجتی ہوں۔"

حامد نہیں چاہتا تھا کہ اس کا باپ اس کے ہاں آئے اور اسے سلیمہ کو حاصل کرنے کے متعلق ہدایات دے۔ وہ ماں کے جانے سے چند لمحے بعد اپنے گھر کو مقفل کر کے ایک تنگ گلی میں سے لپک کر اپنے پرانے گھر جا نکلا۔ بڑھیا ابھی لاٹھی ٹیک کر چولہے کے قریب دھپ سے بیٹھی ہی تھی کہ دھڑ سے دروازہ کھلا' اور ـــــــ!

"ارے حامد۔"

اور شاید اس کی ماں نے گھر کی چار دیواری کے اندر قدم دھرتے ہی سارا حال ایک سانس میں کہہ ڈالا تھا۔ کیونکہ اندر سے ایک گرجتی آواز آئی۔ "کہاں ہے حامد۔ ادھر آنا بیٹا۔ یہ تم نے کیا گل کھلائے؟؟"

www.iqbalkalmati.blogspot.com

حامد مسکراتا ہوا ایک کھٹولے پر بیٹھ گیا اور بولا۔ "آپ کا پورا حق ہے کہ آپ اپنی اولاد کو سمجھائیں اور سیدھی راہ پر لائیں۔ لیکن بات دراصل یہ ہے کہ آپ کے دوست کی بیٹی کسی شاہنشاہ کی ملکہ ہوتی تو شاید اس کی اپنے شوہر سے نبھ جاتی۔ یہاں اس کا پالا پڑا ہے ایک کنگلے کلمو ہے دہقان سے۔ وہ بہت اونچی اتری ہے ابا——— وہ بھونڈے کھاٹوں اور مٹی کے برتنوں والے کچے مکان میں نہیں رہ سکتی!"

اس کا باپ کھٹولے کے پائے پر پاؤں رکھ کر بولا۔ "لیکن آخر اس کا باپ کہاں کا راجہ ہے۔ یہی ایک ذرا سی بیٹھک بنوالی ہے پکی اینٹوں کی۔ کیا اسی کے بل پر سلیمہ رانی کو ہمارے گھروندے میں بسنا ناگوار گزرا! میں کہتا تھا تیری ماں سے کہ شیرنی اور ہرن کو یکجا نہ کرنا۔ ہمارا بھولا بھالا حامد ایسی چونچال چھوکری سے کیسے نبھا سکے گا۔ لیکن وہ پکارتی رہی کہ ایسی خوبصورت اور چلبلی لڑکی کو بہو بنانا تو ایک ماں کی سب سے بڑی آرزو ہے' اب چاٹتی پھرے اس کی خوبصورتی اور چلبلاہٹ کو اور روئے اپنی پہلوٹی کے بیٹے کے بھاگوں کو جس نے کچھ روز ہوئے تھانیدار اور ذیلدار کو بھی بھرے مجمعے میں کھری کھری سنا دی تھیں!"

اور بڑھیا چمٹے سے انگارے اکٹھے کرتی ہوئی کہنے لگی۔ "اور جلاؤ مجھ نصیبوں جلی کے جی کو۔ مجھ اللہ ماری کو آگ میں جھونک دو۔ موئے کو مارے شاہ مدار!"

اس روز سے حامد نے اپنے باپ اور بھائیوں کی امداد پر یوں کمر باندھ لی کہ لوگ انگلیاں اٹھانا بھول گئے۔ جب وہ سب تھک کر بیریوں اور نیموں کے نیچے پتلی چھاچھ پی کر حقے کے کش لگاتے اور لیٹتے تو حامد اسی طرح ہل چلاتا رہتا اور جب وہ شام کو چوپال پر اکٹھے ہوتے تو حامد رسیاں بٹتا' بھوسہ صاف کرتا' گھاس کترتا اور اسے دوسرا کوئی کام نہ ملتا تو اپنے پرانے کمبل کو تہ کر کے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

سوئے سے سیتا رہتا کہ بوڑھی گدھی کی پیٹھ ڈھانپنے کے کام آسکے!

ماں باپ نے اسے سمجھایا بجھایا لیکن وہ برابر یہی کہتا رہا کہ "مرد جب بیکار ہو تو اسے بری بری باتیں سوجھتی ہیں۔ اور میں اپنے ماں باپ کے لیے یہی بدنامی کافی سمجھتا ہوں کہ ان کا بیٹا اپنی بیوی کو چند دنوں میں خفا کر بیٹھا۔ مجھے کام کرنے سے خوشی ہوتی ہے' آپ فکر نہ کیجئے۔"

ادھر ایک روز حامد کو ایک دھوبی کی زبانی معلوم ہوا کہ سلیمہ دن بھر چکی پیستی ہے بیلوں کے آگے چارہ ڈالتی ہے۔ منڈیریں لیپتی ہے اور رات کو چراغ کی روشنی میں اپنے بھائیوں کے کپڑے سیتی ہے اور سنا ہے کہ وہ کہہ رہی تھی کہ میں کیا جانوں حامد کون ہے!

اور حامد جل کر پکارا۔ "اور میں کیا جانوں سلیمہ کون ہے۔ اور الو کے پٹھے' تم کون ہو جو مجھے بے بات گلی میں روکے کھڑے ہو۔ بدمعاش۔ حرامزادہ!"

دھوبی بیچارا تو لپک کر ایک ٹوٹی ہوئی دیوار کی اوٹ میں دبک گیا اور حامد پھنکارتا ہوا اپنے نئے گھر میں آیا۔ زنگ آلود قفل کھول کر فرش پر پٹخ دیا۔ شادی کا نیا پلنگ گھسیٹ کر باہر نکالا اور دھم سے گر گیا اور جب صبح اٹھا تو اس کا جسم تپ رہا تھا۔ نبضیں تیزی سے چل رہی تھیں۔ آنکھوں میں جلن تھی اور سینے میں بھاپ کے بگولے!

اس کے ماں باپ اور بھائی اسے ادھر ادھر ڈھونڈتے پھرے۔ ادھر نئے گھر میں آئے تو حامد کو کراہتا دیکھ کر دھک سے ان کے دل بیٹھ گئے اور ان کے دماغوں میں ایسی آوازیں بلند ہونے لگیں جیسے سرکنڈوں کے جھنڈوں میں سے تیز رو جھونکے گزر رہے ہوں!

حکیم جی بلائے گئے۔ انہوں نے کہا کہ مسلسل اور بہت زیادہ محنت سے اس کے قویٰ پر برا اثر پڑا ہے۔ اسے کافی عرصہ تک آرام کرنا چاہیے۔ فی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

الحال اسے پینے کے لیے عرق گلاب اور کھانے کے لیے گلقند دی جائے۔ گلقند تو کہیں سے میسر آ گئی۔ مگر عرق گلاب نہ مل سکا۔ سب لوگ یہی کہتے تھے کہ "ہم موسمی بخار کے زمانے میں عرق گلاب خرید لاتے ہیں۔ یہ موسم بخار و خار کا تو ہے نہیں۔ حامد خاں کا تاپ کوئی انوکھا تاپ ہے۔"

شام ہوئی اور آخر ایک شخص کو گاؤں سے دس میل دور ایک قصبے میں روانہ کر دیا گیا۔ حامد کا بھائی اس کے ہاں پڑ رہا۔ کچھ دیر تک دونوں ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے اور جب چھوٹا بھائی سو گیا تو حامد بہت دیر تک بخار کی شدت سے پریشان کروٹیں بدلتا رہا اور سوچتا رہا کہ یہ ستارے ٹوٹ ٹوٹ کر آسمان کے اندھیرے میں ہمیشہ کے لیے غرق ہو جاتے ہیں یا اندھیرے میں ڈبکی لگا کر دنیا کی دوسری طرف جا ابھرتے ہیں۔ اور اگر یہ ستارے ٹوٹ ٹوٹ کر نابود ہو جاتے ہیں تو ابھی تک نظام شمسی ختم کیوں نہیں ہوا۔ روز اول سے اگر یہ ٹوٹنے اور اندھیرے میں کھو جانے کا سلسلہ جاری ہے تو ابھی تک یہ چنگاریاں چمچما کیوں رہی ہیں! ــــــ تو کیا ٹوٹے ہوئے ستارے پھر بھی ابھرتے ہیں ــــــ اور ــــــ پھر اسے سلیمہ یاد آ گئی اور وہ سوچنے لگا کہ اس وقت وہ ایک گدگدے پلنگ پر پڑی مزے سے سو رہی ہو گی اور پریوں اور فرشتوں اور بہشتوں کے خواب دیکھ رہی ہو گی۔ اسے یہ احساس تک نہ ہو گا کہ اس کا حامد بخار کی حدت سے تڑپ رہا ہے۔ اور عنقریب وہ ستارے کی طرح ٹوٹ کر کھو جائے گا اور دوسرے ستارے اسی طرح چمکتے رہیں گے اور یونہی اندھیری راتیں اور روشن دن گزرتے جائیں گے اور کسی کو وہم تک نہ ہو گا کہ اسی آسمان پر کسی روز ایک ستارا ــــــ! اور اچانک اسے کسی کے پاؤں کی ہلکی سی چاپ سنائی دی۔ دروازے کے پاس ایک پتلا سا سایہ اس کی طرف دھیرے دھیرے کھسکتا آ رہا تھا۔ بہت مشکل سے حامد نے اپنا خیال آلود سر اٹھایا اور بولا۔ "کون ہو تم؟" لیکن سایہ آگے بڑھا اور چار کانپتی ہوئی انگلیوں کی تپتی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اور بھیگی ہوئی پوریں حامد کی دھڑکتی پھڑکتی نبض پر رکھ دی گئیں۔ "تم کون ہو؟" وہ چلایا ــــــ حامد کا بھائی ایک کروٹ بدل کر سو گیا ــــــ اور یہ سایہ جھکا۔ فرش پر سے ایک گلاس اٹھا کر اس میں کچھ چیز انڈیلی اور آواز آئی۔ "اٹھو' یہ عرق گلاب پی لو!"

"سلیمہ!" حامد پھنکارا۔ "تم؟"

"ہاں' میں سلیمہ۔"

"تم کہاں؟"

"سنا تھا تمہیں عرق گلاب کی ضرورت ہے اور ہمارے ہاں عرق گلاب کی ایک پوری بوتل رکھی تھی!"

حامد کی نبضوں کی رفتار تیز ہوگئی اور اس کا جسم اور زیادہ تپ گیا۔ اس نے عرق گلاب پی لیا تو سلیمہ اس کے قریب بیٹھ گئی اور اس کے تپتے ہوئے گالوں کو اپنی ملائم ہتھیلیوں میں دبا کر بولی۔ "بس اتنا سا حوصلہ تھا تمہارا؟"

"اور تمہارا! ــــــ تمہارا بھی اتنا سا حوصلہ تھا؟"

سلیمہ کا سر حامد کے بالکل قریب آگیا۔ یہاں تک کہ حامد کی گرم سانسیں اور سلیمہ کی سرد آہیں ایک دوسرے میں الجھ کر رہ گئیں اور منہ اندھیرے جب حامد کے ماں باپ اور بھائی اس کے پاس آئے تو انہوں نے دیکھا کہ سلیمہ بیٹھی حامد کے پاؤں داب رہی ہے۔ اور حامد خواب میں بڑبڑا رہا ہے ــــــ "کیا یہ ٹوٹے ہوئے تارے ڈوب کر پھر ابھر آتے ہیں ــــــ یہ ڈوبتے ہوئے تارے!"

* * *

www.iqbalkalmati.blogspot.com

قلی

سرما کی اندھیری راتیں تھیں اور مجھے سارے شہر میں گشت کرنا پڑتا تھا۔ میں پولیس میں نیا نیا بھرتی ہوا تھا اور ملازمت کے ان ابتدائی ایام میں میری یہ کوشش تھی کہ رات دن کی جان توڑ محنت سے افسروں کی نظروں میں وقعت حاصل کر لوں اور اپنے مستقبل کو روشن کرنے کی کوئی سبیل بھی ڈھونڈ نکالوں۔ اسی لیے میں راولپنڈی ایسے گنجان شہر کی تنگ گلیوں میں بہت رات گئے تک ٹھٹھرتا رہتا۔ مجھے بعد میں جا کر محسوس ہوا کہ بڑے افسر راتوں کو نکل کر اپنے ماتحت عملہ کی جانفشانی نہیں دیکھا کرتے کیونکہ وہ شام ہوتے ہی بیشمار مصروفیتوں میں گھر جاتے ہیں ——— سنیما! ——— شراب! ——— عورت!

بہر حال روزانہ میں سارے شہر کا چکر کاٹتا اور آبادی کے آخری سرے پر ایک بوسیدہ سے ہوٹل میں بیٹھ کر ایک آدھ گھنٹہ گزارتا۔ وہاں مجھے کالے رنگ کی گرم چائے کی ایک پیالی بھی مل جاتی۔ مدھم روشنی اور دھوئیں کی وجہ سے میرے ٹھٹھرے ہوئے جسم کو آرام سا محسوس ہوتا اور آس پاس بیٹھے ہوئے غریب قلیوں کی باتیں سن کر بڑا سکون حاصل ہوتا!

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اس ہوٹل میں اکثر قلی ہی آیا کرتے تھے۔ اسٹیشن نزدیک تھا اور پھر اس ہوٹل میں ایک پیالی چائے ایک پیسے میں ملتی تھی۔ مزے سے گپیں ہانکو ہنسو کھیلو بنچوں پر لیٹو اور ٹین کی کرسیاں بجاؤ اور گاؤ اور جب گاڑی کی گھماں گھم سنائی دے تو بازوؤں پر پیتل کے بلے باندھ کر بھاگ نکلو!

لوہے کی ایک کرسی جس پر کبوتروں کی خشک بیٹوں سے چھینٹ سی بچھی رہتی تھی!

کمزور سی میز جو ذرا سے مس سے چر چر بولنے لگتی تھی! ——— اور بوڑھا حقہ جس کی نال پر خدا نے جانے کتنی مدت کے چیتھڑے لپٹے ہوئے تھے' میرے منتظر ہوتے۔ میں ہوٹل کے اندر قدم دھرتے ہی یوں محسوس کرتا جیسے بہت لمبے سفر کے بعد اپنے گھر واپس آ گیا ہوں۔ دھواں اور دور چولہوں کے ساتھ والی دیوار سے لٹکی ہوئی پرانے فیشن کی لالٹین!

انہیں دیکھ کر میرا سکڑتا ہوا دل پھیل جاتا۔ کونے میں پرانی کرسی پر بیٹھتا کہ کھٹ سے کالی گرم چائے کی ایک پیالی میرے سامنے آ دھمکتی اور میں پشاور کے قرب و جوار کے رہنے والے تند مزاج پروپرائٹر کا شکریہ ادا کر کے قلیوں کی باتیں سننے میں محو ہو جاتا۔

"اے فضل دین۔ یار تم تو دلی پار ہو آئے ہو۔ سنا ہے بڑے بڑے ہوٹل ہوتے ہیں ان شہروں میں۔"

فضل دین سرخ قمیض کی جیب سے چنے نکالتے ہوئے کہتا۔ "اتنے بڑے بڑے ہوٹل دیکھے ہیں میں نے کہ سارا راولپنڈی شہر ان میں سما جائے۔ فرش پر دیکھو تو جیسے دریا پر چل پھر رہے ہوں۔ کمروں میں جاؤ تو جیسے جنت میں داخل ہو گئے۔"

لمبے لمبے پائنچوں کی بھونڈی سی شلوار والا ایک نوجوان کہتا ———

"وہاں بھی ایک پیالی چائے ایک پیسے میں ملتی ہے؟"

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"نہیں بے۔ تو نے کیا انہیں بھنگڑ خانہ سمجھ رکھا ہے۔ چونی میں آتی ہے ایک ننھی سی پیالی۔"

"تو ہمارے کس کام کے وہ ہوٹل ہمارے لیے چچا گل باز خان کا ہوٹل ہی اچھا ہے۔"

آگرے کا رہنے والا ایک قلی پان کی پیک دیوار پر پھینکتے ہوئے بولا۔ "ہم نے بمبئی میں تاج محل ہوٹل دیکھا ہے۔ سمندر کے کنارے کھڑا ہے۔ خدا کی قسم ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فرشتے آسمانوں پر اپنے ہاتھوں سے بناتے رہے اور کسی رات کو چپکے سے اسے زمین پر اتار لائے اور سمندر کے کنارے نصب کرکے اڑ گئے۔"

فضل دین اپنے مدِمقابل کو دیکھ کر جل اٹھتا اور کہتا۔ "اے میر صاحب' تاج محل ہوٹل نہیں مقبرہ ہے اور بمبئی میں نہیں آگرہ میں ہے اور سمندر کے کنارے نہیں' جمنا کے کنارے ہے۔ سمجھے؟"

میر صاحب کچھ کہنا چاہتے مگر قہقہوں کے طوفان سے تنگ آکر چلو بھر پیک اگل کر رہ جاتے!

میں انہیں چھیڑنے کے لیے سگریٹ سلگاتے ہوئے پوچھتا۔ "بھئی سرخ قمیض میں سفید بٹن! یہ کیا مذاق ہے۔؟"

لمبے لمبے پائنچوں کی شلوار والا نوجوان جواب دیتا۔ "سفید بٹن سستے ہوتے ہیں۔"

"ایک آنے کے چوبیں" ایک طرف سے آواز آتی۔

"لیکن پہلی دھلائی میں ٹوٹ جاتے ہیں کمبخت۔" ایک دل جلا پکار اٹھتا۔

اس پر ایک بوڑھا قلی واعظانہ انداز میں کہتا۔ "بھورانی سے کہو پتھروں پر نہ پٹخا کرے۔"

www.iqbalkalmati.blogspot.com

آہ بھر کر وہی کہتا۔ "اے میری بہو تو کب کی مر چکی ہے۔ پڑوسن سے
......"

پڑوسن سے؟" ——— سب چیخ کر پوچھتے اور کالے چہرے چیڑ کی کمزور میزوں پر مارے ہنسی کے جھک جھک جاتے! کئی بار قہقہوں میں یوں گم ہو جاتے کہ بے خبری میں کوئی پیالی فرش پر جا گرتی اور پشاوری پروپرائٹر کے ہولناک نتھنوں سے اس زور کی تیز تیز سانسیں نکلتیں کہ اس کی بڑی بڑی گھنی مونچھیں تھرتھرانے لگتیں۔ لال لال آنکھیں نکالتے ہوئے کہتا۔ "چونی کی پیالی کا ستیاناس کر دیا!"

میں سفارش کر دیتا۔ "ارے بھئی روز کے گاہک ہیں۔" اور پشاوری پروپرائٹر گول پگڑی کو دونوں ہاتھوں سے سر پر دباتے ہوئی کہتا۔ "تھانیدار صاحب کے کہنے پر چھوڑے دیتا ہوں ورنہ شلواریں اتروا لیتا۔"

بڑی دلچسپ محفل رہتی۔ روزانہ گشت کے دوران ہوٹل جانا میرا معمول ہو گیا اور جس روز مجھ سے ناغہ ہو جاتا طبیعت سارا دن پریشان رہتی اور دل پر ایک بے نام سا بوجھ رہتا۔

ایک روز کڑاکے کا جاڑا پڑ رہا تھا۔ بوندا باندی بھی ہو رہی تھی ٹھنڈی تیز ہوا ہڈیوں سے سرسراتی ہوئی گزر جاتی۔ اندھیری گلیوں میں رینگتے ہوئے لوگ فضا میں تیرتے ہوئے دھبے معلوم ہوتے اور دور گلی کے موڑ کی بتی دھند میں لپٹی ہوئی یوں دکھائی دیتی جیسے مرتے ہوئے انسان کی عرق آلود زرد پیشانی! کائنات پر ہیبت سی چھا رہی تھی۔ فراغت حاصل ہوتے ہی میں نے ہوٹل کا رخ کیا۔ آج کالے رنگ کی گرم چائے کی پیالی بار بار میرے سامنے آکر منڈلاتی تھی اور میرا کپکپایا ہوا سینہ اور شدت سے سکڑنے لگتا تھا۔ ہوٹل میں قدم رکھا تو صرف تین قلی ایک طرف بیٹھے ہوئے نظر آئے۔ ان میں سے ایک انگلیوں پر کچھ حساب کر کے پھر گھٹنوں میں سر گھسیڑ دیتا اور میری کرسی کے قریب ایک

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اور قلی بیڑی کا کش لگا کر بیڑی کے سرے سے اٹھتی ہوئی دھوئیں کی لہراتی ہوئی لکیر کو اوپر دھواں دھار خلا میں ضم ہوتا دیکھ رہا تھا!

قریب آکر میں نے اسے پہچانا۔ وہ لمبے لمبے پائنچوں کی بھونڈی سی شلوار والا قلی تھا۔ اس کا نام محمد دین تھا اور وہ اٹک کے آس پاس کا رہنے والا تھا۔ مجھے اکثر اس سے باتیں کرنے کا اتفاق ہو چکا تھا اور میں محسوس کرتا تھا کہ اگر یہ نوجوان پڑھا لکھا ہوتا تو یقیناً ایک ایسا زبردست شاعر ہوتا کہ قومیں اس کے کلام کو الہام تصور کرتیں اور خاک نشینوں کی خوابیدہ روحوں میں انقلاب کے شرارے جھجھمانے لگتے۔ اس کی باتوں میں دبی دبی آگ سی ہوتی تھی اور باتوں سے فارغ ہو کر وہ ایسی ایسی حرکتیں کرتا کہ میں اسے راولپنڈی کا بہت بڑا تخیل پرست قلی سمجھنے پر مجبور ہو گیا۔ اسے دیکھ کر میں اکثر سوچا کرتا کہ اگر کالی داس، شکسپیئر، ملٹن، تلسی داس، گوئٹے، حافظ، غالب اور اقبال بھی محمد دین کی طرح قلی ہوتے تو انہیں کون پوچھتا۔ وہ بھی دھواں دھار ہوٹلوں میں بیٹھ کر بیڑی کے سرے سے اٹھتی ہوئی دھوئیں کی لکیر کو اوپر اندھیرے میں تحلیل ہوتے دیکھتے اور پیٹھ پر فولادی صندوق اٹھاتے وقت دھیمی لے میں گاتے۔

عزت دی موت بھلی
بے عزتی دے جینے کولوں
عزت دی موت بھلی

اور محمد دین کچھ پڑھا لکھا ہوتا تو اس کے کلام کو سنہری جلدوں میں سجا کر منقش الماریوں میں رکھا جاتا اور لوگ اس کا نام سنتے ہی فرطِ عقیدت سے جھک جھک جاتے! قدرت نے انسان کو حالات کا غلام پیدا کیا ہے! یہ حقیقت مجھے محمد دین سے مل کر معلوم ہوئی۔

کرسی کو بجتے اور میز کو چرچراتے سن کر وہ چونکا، میری طرف دیکھ کر تعظیماً" اٹھا اور بولا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"السلام علیکم تھانیدار جی!"

"وعلیکم السلام" میں نے محبت سے جواب دیا۔

وہ یہ کہتا ہوا دروازے کی طرف بھاگا۔ "آپ کا سائیکل بھیگ نہ جائے میں اندر رکھ دوں۔ اسے۔" سائیکل اٹھا کر اندر لے آیا اور دیوار سے ٹکا کر میری طرف آنے لگا۔

"تم نے ناحق تکلیف کی' بھیگا ہوا سائیکل......."

اس نے میری بات کاٹ کر کہا۔ "آپ تشریف تو رکھیں۔"

"آج تمہارے دوسرے ساتھی کدھر گئے۔"

"گھروں میں دبکے بیٹھے ہوں گے۔ اس موسم میں انکا باہر نکلنا موت کے منہ میں جانا ہے۔ نہ کمبل نہ چادر۔ ٹھٹھر کر اکڑ جائیں گے بیچارے تو بھوکی مائیں' بہنیں' بیویاں اور بچوں کی فوجیں کون سنبھالے؟ کل دگنی محنت کریں گے' کیا کریں!"

میں نے پوچھا "تم کیوں چلے آئے؟"

"سارا دن بیٹھے بیٹھے جی اکتا گیا ہے' ادھر آنکلا کہ باتوں میں وقت کٹ جائے گا۔ مگر ادھر فضل دین بیٹھا اپنے قرض کا حساب کر رہا ہے اور ہدایت خاں وہ الگ پڑا بھوک کے مارے اونگھ رہا ہے۔"

اچانک محمد دین کرسی پر بیٹھے بیٹھے اٹھ کھڑا ہوا اور پکارا۔ "اے خاں جی' چار پیالیوں والی چائے دانی لانا۔"

چائے لائی گئی۔ اس نے پشاوری پروپرائٹر کے ہاتھ سے چائے دانی لے کر میری میز پر رکھ دی اور بولا "پیجیے۔"

"میں حیران ہو کر بولا۔ "یہ کیوں؟"

جیب سے اکنی نکال کر خان کی مٹھی میں دباتے ہوئے بولا۔ "پی لیجیے' کیا ہرج ہے!"

www.iqbalkalmati.blogspot.com

جو شخص میل ڈیڑھ میل تین چار من کا بوجھ پیٹھ پر اٹھائے ہانپتا جائے اور بدلے میں ایک اکنی پائے اس کے نزدیک اسے اکنی کی کیا یہی قیمت ہے کہ پولیس کے تھانیدار جی پر جن کا خیال مفلسوں کو کابوس بن کر ڈراتا رہتا ہے' نچھاور کر دے! یہ بات میری سمجھ میں نہ آئی۔ میں نے پوچھا۔ محمد دین' آخر تم نے یہ تکلیف کیوں کی؟"

وہ ٹھوڑی کو بائیں ہاتھ کی انگلیوں میں دباتے ہوئے بولا۔ "آپ بہت اچھے ہیں تھانیدار جی' آپ بہت اچھی باتیں کرتے ہیں' آپ مجھے بہت اچھے لگتے ہیں۔"

دھواں دھار کمرہ ——— ٹمٹماتی ہوئی لالٹین ——— کھانستا ہوا پشاوری پروپرائٹر ——— اونگھتے ہوئے قلی ——— گیلا فرش اور شکستہ فرنیچر! ——— سارا منظر میرے سامنے جھولنے لگا۔ میری میز چرچرائی جیسے تعجب کا اظہار کر رہی ہے۔ دائیں طرف دیوار کے اوپر ایک چھپکلی چھرررر کی آواز پیدا کرتی چھت میں گھس گئی۔

محمد دین دونوں کہنیاں میز پر ٹیک کر بولا۔ "پیجئے۔"

میں چائے پینے لگا تو وہ بولا۔ "آپ تو اتنے اچھے ہیں تھانیدار جی' مگر پولیس کا محکمہ اتنا بدنام کیوں ہے؟"

میں بولا۔ "اصل میں لوگ نہیں سمجھتے۔ ہم مجرموں اور بدمعاشوں کو پکڑنے والے ہیں' چمکارنے پچکارنے سے انہیں ہم قابو میں نہیں لا سکتے۔ انہیں یہ کہنا نادانی ہے کہ "آیئے حضرت تشریف لایئے' تاکہ آنجناب کو حوالات میں بند کر دیا جائے۔" کچھ سخت کلامی کرنی پڑتی ہے' کچھ ہاتھ اٹھانا پڑتا ہے اور لوگ سمجھتے ہیں کہ پولیس والے فرعون اور نمرود کی پشتوں سے بھی نیچے لڑھک گئے ہیں۔ اصل میں دنیا نہیں سمجھتی۔"

"جی ہاں' دنیا نہیں سمجھتی۔" محمد دین نے سرخ قمیض کی جیب سے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ایک پھٹا پرانا رومال نکال کر میرے گھٹنوں پر پھیلاتے ہوئے بولا۔ "قطرہ نہ گرے چائے کا ـــــــ آپ کی وردی نہ خراب ہو جائے۔"

میں نے شکریہ ادا کرتے ہوئے پوچھا۔ "تم دن میں کتنا کما لیتے ہو؟"

"میں دن کے وقت بہت تھوڑا کام کرتا ہوں۔ میری ایک بوڑھی ماں اور ایک کنواری بہن ہے۔ دن بھر اس کے پاس پڑا رہتا ہوں اور رات کو گاڑیاں دیکھتا ہوں صرف اس لیے کہ رات کو اسٹیشن پر قلیوں کی تعداد کم ہوتی ہے اور رات کو مسافر ہمیں مقررہ نرخ سے کچھ زیادہ ہی دے جاتے ہیں۔ ساری رات کام کرتا ہوں، صبح جا کر سو رہتا ہوں۔ اب میری ضعیف ماں اور غم زدہ بہن دعائیں مانگ رہی ہوں گی کہ اللہ کرے میں آج کی ٹھنڈ سے محفوظ رہوں۔ غریب مفت میں اپنی نیند حرام کر رہی ہوں گی انہیں کیا معلوم کہ میں گرم ہوٹل میں بیٹھا تھانیدار جی سے باتیں کر رہا ہوں۔"

اس کی آنکھوں میں غرور سا چھلکنے لگا اور میری طرف کچھ اس انداز سے دیکھا گویا وہ میرا بہت ممنون ہے۔ میں نے اس کے ہاتھ پر تھپکی دیتے ہوئے کہا۔ "کے گاڑیاں دیکھتے ہو رات کو؟"

"سات آٹھ۔"

"کتنا کما لیتے ہو؟"

"آٹھ دس آنے مل جاتے ہیں اکثر۔"

"جب قلی کے سامنے کوئی ایسا کمرہ رکتا ہو گا جس میں سے کوئی مسافر نہ اترے تو وہ بہت مایوس ہوتا ہو گا۔ ہے نا؟"

وہ بولا۔ "روز کا تجربہ ہے جی۔ کچھ محسوس نہیں کرتا۔ کسی دوسرے قلی بھائی کے بوجھ اٹھانے میں مدد دے دی، چلو طبیعت ہلکی ہو گئی۔ یوں ہم جی ہی جی میں کڑھنے لگیں تو دوسرے ہی دن چارپائی سے لگ جائیں ـــــــ اور رات کو تو ہمیں کافی آزادی ہوتی ہے۔ دو چار کمرے دیکھ لیتے ہیں اور ہم سب

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کی یہی کوشش ہوتی ہے کہ کسی اچھے پیسے والے کا اسباب اٹھائیں۔"

میں نے تعجب سے پوچھا۔ "لیکن تمہیں مسافروں کے حالات کی کیا خبر؟"

"روز کا تجربہ ہے ناجی۔ ہم مسافروں کی چال ڈھال' وضع قطع دیکھنے سے ان کے حالات کا اندازہ لگا لیتے ہیں۔ لیکن ایک بار مجھے بڑا دھوکا ہوا۔ ایک سیٹھ جی کا اسباب اٹھایا جن کو میں نے قیافہ کی مدد سے بڑا فراخدل سمجھا۔ اسباب ٹانگے پر آکر دھرا اور ہاتھ بڑھایا تو دو پیسے ہتھیلی پر آگرے۔ میں نے تعجب سے پوچھا۔"سیٹھ جی۔ مقررہ اجرت تو ایک آنہ ہے اور آپ کے صندوق میں تو جیسے سیسہ بھرا ہوا تھا۔"

مونچھوں پر پانچوں انگلیاں پھیرتے ہوئے بولے۔ "کبھی پیسے کی شکل بھی دیکھی ہے تونے؟" ——— اس روز مجھے بہت شرمندگی اٹھانا پڑی۔ اکثر ہمارا قیافہ غلط نہیں نکلتا لیکن کبھی کبھار انسان دھوکا کھا ہی جاتا ہے۔"

بہت دیر تک ہم اس قسم کی باتیں کرتے رہے۔ باہر تیز ہوا چل رہی تھی اور تاریک ہوٹل کی چھت کے سوراخ میں پھوار کبھی کبھار اندر بھی پڑنے لگتی تھی۔ دور پشاوری پروپرائٹر مٹی کے کشکول میں چائے پی رہا تھا اور قلی میزوں پر سر رکھے ہوئے سو رہے تھے کہ اچانک محمد دین کھڑا ہو گیا۔ "گاڑی آرہی ہے شاید۔ میں اسٹیشن جاتا ہوں۔ اجازت ہے؟"

میں نے چائے کا آخری گھونٹ پیتے ہوئے کہا "ضرور۔" اس نے فضل دین اور ہدایت خان کو شانوں سے پکڑ کر جھنجھوڑا اور تینوں سرخ قمیضیں دروازہ کھول کر چنگھاڑتے ہوئے طوفان کے ہولناک اندھیرے میں جذب ہو گئیں۔ میں سائیکل کو گھسیٹتا تنگ گلیوں کے غلیظ کیچڑ میں پھسلتا ہوا رات کے دو بجے گھر آن گرا۔

لیکن اس رات مجھے نیند بہت کم آئی۔ میں سوچتا رہا کہ اپنی جوانی کو

www.iqbalkalmati.blogspot.com

چٹانوں تلے دبا کر کمانے والے یہ مفلس قلی کیا محبت کرنا بھی جانتے ہیں؟ کیا ان میلی جیکٹ سرخ قمیضوں کے تلے بھی حساس دل دھڑکتے ہیں؟ پیسے پیسے کے لیے دست سوال دراز کرنے والے یہ انسان کیا ایسے ہلکے پھلکے جذبات سے عاری نہیں ہوتے؟ کیا یہ سوکھی روٹی اور سرسوں کے ساگ سے پیٹ بھرنے والے اندھیری کوٹھڑیوں اور متعفن محلوں میں بسنے والے یہ لوگ انسانیت کے درجے سے گر نہیں جاتے؟

میں تا دیر یہ باتیں سوچتا رہا کہ خودداری اور غرور نفس سے ان ہڈیوں کے ڈھانچوں کو کیا کچھ سروکار ہوتا ہے؟ کیا یہ ننگے پاؤں اور بے رونق آنکھوں والے مزدوروں کو...... نہ جانے میں اس رات کیا سوچتا رہا!

دوسرے روز گشت کے دوران ہوٹل کا رخ کیا تو دور ہوٹل کے دروازے پر محمد دین میرا منتظر کھڑا تھا۔میرا سائیکل اٹھا کر اندر دھر دیا اور میری میز کرسی کو جھاڑنے کے لیے بڑھا۔ آج میری جگہ ایک قلی بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ بیچارا یوں اچھل کر پرے جا گرا جیسے غلطی سے شیر کے منہ پر بیٹھ گیا ہے۔

آج موسم اچھا تھا اور ہوٹل میں خوب رونق تھی۔محمد دین اپنی کرسی اٹھا کر میرے قریب لے آیا۔ سب قلی اسے حیرت سے دیکھنے لگے۔ ایک غریب قلی پولیس کے تھانیدار کے اس قدر قریب بیٹھ جائے! یہ بات ان کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔

آج بھی اس نے مجھے چائے پلانا چاہی لیکن میں نے اسے بہت منتوں کے بعد روک دیا۔ اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے ہوئے محمد دین بولا۔ "قلی کا پیشہ برا نہیں، تجارت ہے ایک قسم کی۔ اپنی جسمانی قوت دو اور پیسے لو۔ قلیوں کے لیے مہنگا اور مسافروں کے لیے سستا سودا ہے لیکن برا نہیں۔ ہاں ایک بات مجھے بے حد کھٹکتی ہے۔کبھی کبھی اسٹیشن ماسٹر مجھے اپنے گھر بلا لیتا ہے۔ میں اس کے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کمرے جھاڑتا ہوں۔ بوٹ صاف کرتا ہوں اس کے پاؤں دابتا ہوں۔ وہ کہتا ہے میرا داہنا بازو قلم چلاتے چلاتے تھک گیا ہے کمبخت میری پیٹھ کو نہیں دیکھتا' جس پر بوجھ اٹھاتے اٹھاتے نیلی گانٹھیں پڑ گئی ہیں پھر وہ اپنا ننھا بچہ میری گردن پر بٹھا دیتا ہے اور کہہ دیتا ہے کہ باغیچے میں کھلاؤ ——— قمیض اتار کر!"

میں نے پوچھا۔قمیض اتار کر؟"

"جی ہاں۔ کہتا ہے سرخ قمیض اتار کر میرے بچے کو باغیچے میں لے جایا کرو' ورنہ لوگ سمجھیں گے اسٹیشن ماسٹر قلیوں کو بیگار میں پکڑ لیتا ہے مفت میں بدنامی ہو گی۔میں اس کے ضدی بچے کو گھنٹوں اٹھائے اٹھائے پھرتا رہتا ہوں اور جب واپس جاتا ہوں تو گھر کی بتائی جاتی ہے کہ اتنی جلدی کیوں لوٹ آئے یہ باتیں میرے دل میں کھٹکتی ہیں ورنہ قلی کا پیشہ کچھ برا نہیں۔"

میں نے پوچھا۔ "اجرت ملتی ہے کچھ؟"

"جی ہاں۔"

"کیا؟"

"تیری قمیض چھین لی جائے گی۔ تیرا نمبر ضبط کر لیا جائے گا' تجھے قید کرا دوں گا میں۔ تو بازار سے سودا لینے جاتا ہے جو چونی میں اکنی ضرور ہضم کر جاتا ہو گا بھوکا کتا' غلیظ چھوکرا ——— یہ اجرت ملتی ہے مجھے!"

میں نے کہا "یہ بھی روز کا تجربہ ہے نا؟"

"جی ہاں! ہے تو روز کا تجربہ لیکن ذرا تلخ سا تجربہ ہے۔ یہ مجھے کچھ اچھا نہیں لگتا۔ دل میں ٹیس سے اٹھتی ہے ان باتوں سے ورنہ یوں ہم دو دو تین تین پیسوں پر جان دینے والے جاہل لوگ ایسی باتیں کیوں محسوس کرنے لگے۔ میں ذرا نرم دل سا واقع ہوا ہوں۔ ایسی باتیں مجھے بہت چبھتی ہیں۔اب کل ہی کی سنئے۔ میں بارش کے طوفان میں ٹھٹھرتا ہوا' گاڑی کے وقت پر پہنچا اور ایک مسافر نے مجھے اشارہ بھی کیا۔ اس کی طرف بڑھا ہی تھا کہ ایک بابو مجھے بازو سے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

پکڑ کر دفتر میں لے گیا اور میرے سر پر پھلوں کا ایک بہت بڑا ٹوکرا رکھ کر بولا "میرے کوارٹر میں رکھ آؤ۔ اسے ـــــــ جلدی ـــــــ ایک منٹ میں ـــــــ راستے میں پھلوں کو چھیڑنا نہیں۔"

میں اگر انکار کرتا تو میری قمیض اور نمبر ضبط کر لیے جاتے۔ اس مسافر کو ایک اور قلی مل گیا مجھے اس بات سے مسرت ضرور ہوئی کہ میرے ایک اور بھائی کا تو صبح کا کھانا بن گیا مگر گھر آ کر ماں بہن کا فاقہ دیکھ کر بہت دیر تک رویا۔ ساری رات نیند نہ آئی۔ جگہ جگہ سے چھت ٹپکنے لگی۔ کھپریل کا چھپر ایسی موسلا دھار بارش کو کیا خاک روکتا۔ جھک گیا ہم کھسکتے کھسکتے ایک کونے میں آ گئے۔ اس حالت میں کہ میرا سر ماں کی گود میں تھا۔ اور میرا بازو بہن کے گھٹنوں پر۔ تھانیدار جی' اچانک میری گردن اور میرے بازو پر چار گرم گرم قطرے آن پڑے۔میں جانتا ہوں وہ بارش کا پانی نہ تھا۔ آنسو تھے۔ پڑوس میں ایک ماسٹر جی رہتے ہیں خیال آیا کہ ان سے روٹی کا ٹکڑا مانگ لاؤں مگر....... گاڑی آ رہی ہے' اجازت ہے مجھے؟"

وہ اٹھا' سرخ قمیض بجلی کی طرح دروازے سے باہر نکل گئی اور اندھیرے کمرے میں پشاوری پروپرائٹر کے سرحدی حقے کی گڑ گڑ گڑ اور میرے دل کی دھم دھم سے قطع نظر مکمل سکوت طاری ہو گیا۔

اس کے بعد چار دن تک مجھے محمد دین نظر نہ آیا۔ قلیوں سے پوچھا مگر انہیں اس کے سوا کچھ خبر نہ تھی کہ وہ اب اسٹیشن پر نہیں آتا۔ شاید منڈی میں مزدوری کر رہا ہے۔

پانچویں دن میں ہوٹل کے قریب سڑک پر چل پھر رہا تھا۔ میرے پہنچتے ہی اس نے جھک کر سلام کیا۔ میرا سائیکل اٹھا کر اندر دیوار سے لگا دیا۔ میری میز کرسی کو جھاڑا اور بولا۔

"خیریت رہی تھانیدار جی!"

www.iqbalkalmati.blogspot.com

میں نے کہا۔ "تم سناؤ' اتنے دن کہاں رہے۔"

وہ کرسی گھسیٹ کر میرے قریب بیٹھ گیا اور سر جھکا کر بولا۔" بہن کو نمونیہ ہو گیا تھا۔"

"پھر؟" میں نے بیتاب ہو کر پوچھا۔

"آج چل بسی۔" اس کی آنکھیں بھر آئیں' ہونٹ کانپ گئے۔ حلق گھٹ گیا۔

"بہت افسوس ہوا مجھے۔ مجھے ہمدردی ہے تم سے۔ اس کے دوا دارو کے لیے پیسے کہاں سے لاتے رہے؟"

"کہیں سے نہیں جی۔ مجھے اس کی تیمار داری سے فرصت ہی کہاں تھی کہ اسٹیشن کے چکر لگاتا۔ ماں بہت بوڑھی ہے اور بہن بیچاری بہت کمزور تھی۔ فاقوں نے اور نڈھال کر دیا تھا۔ تین دن کراہتی رہی۔ آج ختم ہو گئی۔ ماں الگ بیمار پڑی ہے —— مجھے کسی سے کچھ مانگتے شرم آتی ہے تھانیدار جی۔ عمر بھر اپنا پسینہ بہا کر کماتا رہا اور کھاتا رہا۔ اب بغیر کوئی کام کیے کسی سے کچھ مانگتے شرم آتی ہے۔ میں ذرا نرم دل واقع ہوا ہوں' دل میں ٹیس سی اٹھتی ہے ان باتوں سے۔مانگنے کی جرات نہیں ہوتی۔ آج اس کے مرنے کے بعد بازار میں مزدوری کرتا رہا۔ اس کے کفن دفن کی کچھ تدبیر کی۔ اب ...."

میں نے بات کاٹ کر کہا۔ "مگر محمد دین' دوسروں کو چھوڑو۔ تم نے مجھ سے کیوں نہ مانگا؟"

"مجھے کسی سے مانگتے شرم آتی ہے تھانیدار جی ——" وہ رک گیا ذرا وقفے کے بعد پکارا۔ "اے خان جی! چار پیالوں والی چائے دانی دے جانا۔"

"کیوں؟ کس لیے؟" میں نے پوچھا۔

اس نے اکنی جیب سے نکالی اور پشاوری پروپرائٹر کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے کہا "پیجئے' پی لیجے۔ کیا ہرج ہے تھانیدار جی —— گاڑی آرہی ہے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

شاید' اجازت ہے مجھے؟" اور وہ بے شمار سرخ قمیضوں کے ریلے میں دروازے سے نکل کر اندھیری رات میں گم ہو گیا۔ میری میز چرچرائی اور دائیں طرف دیوار پر ایک چھپکلی چھرررر کی آواز پیدا کرتی چھت میں گھس گئی۔ میری چائے پڑے پڑے ٹھنڈی ہو گئی!

* * *

www.iqbalkalmati.blogspot.com

السلام علیکم

گاؤں میں چٹھی لکھ دیتا تو اسٹیشن پر کوئی ٹٹو' خچر یا گدھا ضرور موجود ہوتا۔ لیکن اول تو اسے خط لکھنے کا وقت ہی نہ ملا۔ دوسرے وہ اپنے بیوی اور بچے کو اپنی غیر متوقع آمد سے حیران کرنا چاہتا تھا۔ جب وہ گاڑی سے اترا اور ڈوبتے ہوئے سورج کی ترچھی کرنوں سے ڈھکی ہوئی گول گول ڈھیریاں اس نے چاروں طرف بکھری ہوئی دیکھیں تو اس کے کلیجے پر جیسے کسی نے برف سے زیادہ ٹھنڈی انگلی رکھ دی!

تین سال اس نے فرانس' میسوپوٹیمیا اور مصر میں گزارے تھے۔ تین سال وہ مورچوں میں دم گھونٹ دینے والے حبس میں پڑا رہا۔ کیچڑ سے بھری ہوئی خندقوں میں منہ کے بل لیٹا رہا۔ خاردار جھاڑیوں میں بھوکا پیاسا دبکا رہا۔ جب گولیاں شوکتی ہوئی اس کے سر پر موت کی مہین لکیریں کھینچتی گزر جاتیں اور توپوں کے مہیب گولے مورچوں کے دہانوں کے عین پہلو میں آکر پھٹتے تو وہ دھوئیں اور دھول سے اٹی ہوئی فضا میں اپنی بے رونق آنکھیں جھپکاتا رہ جاتا۔ جب ہوائی جہازوں کی پراسرار بھنبھناہٹ سن کر سپاہی زمین سے چمٹ جاتے اور دھندلی فضا میں سپاہیوں کی ٹانگیں اور باہیں'

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کھوپڑیاں اور بے ڈھنگے دھڑ روئی کے گالوں کی طرح اڑتے نظر آتے تو اس کی ذہنی نظریں اپنے وطن کی پست قد پہاڑیوں پر جم جاتیں اور پھر ان کے درمیان زرخیز وادیوں کے کناروں پر پہاڑیوں کے دامنوں میں ننھے ننھے گاؤں ——— اور پھر گاؤں کے بھولے بھالے باشندوں کی دوستیاں اور دشمنیاں ——— کبڈی کے میلے اور بلوے کی تیاریاں۔ اس کی خوبصورت بیوی اور اس کا بھدا بچہ ——— یہ سب چیزیں رائی کے مرچیں لگا دینے والے پلستر کی طرح اس کے حافظے پر چمٹ جاتیں اور بندوق میں کارتوس ڈالتے ——— دستی بم پھینکتے یا لوہے کے خار دار تاروں پر لکڑی کے تختے یا گلی سڑی لاشیں رکھ کر پھلانگتے ہوئے یہ احساس ہر وقت اس کی ڈھارس بندھائے رکھتا کہ وہ دنیا میں اکیلا نہیں ——— بے یار و مددگار نہیں۔ اس کا اپنا وطن ہے' اپنا گاؤں ہے' اپنا گھر ہے۔ اس کی اپنی بیوی اور اپنا بچہ ہے۔ اس کی زندگی کی دعائیں مانگنے والی اور اس کی موت پر مدتوں تک سوگ منانے والی دو ہستیاں ایک پر امن اور پر سکون جھونپڑی میں موجود ہیں۔

محاذ سے لوٹتے وقت جب وہ کسی زخمی کو لاشوں کے انبار کے نیچے کراہتا دیکھتا یا چند دنوں کے مرے ہوئے سپاہی کے پھولے پیٹ اور سوجے اعضا پر اس کی نظریں پڑتیں تو اس کا دل دھک سے رہ جاتا اور وہ محسوس کرتا جیسے اس نے خود اپنی بگڑی ہوئی لاش پر پاؤں رکھ دیا ہے اور لاش سے کچا بدبو والا غلیظ لعاب رسنے لگا ہے! یہ محسوس کرتے ہی وہ کانپ جاتا جیسے بیشمار بموں کے دھماکے سن کر اس کے کانوں کے پردے پھٹ گئے ہیں اور اس کی چکراتی ہوئی کھوپڑی خاک اور خون کے غیر محسوس ذرے بن کر خلاء میں کھو گئی ہے!

امید و بیم کے ان الجھیڑوں سے نکل کر وہ گھر آرہا تھا' لیکن ایک احساس رہ رہ کر اسے ستاتا تھا۔ اس کی روح کے ایک کچے زخم پر سے بار بار پھاہا اتر جاتا تھا۔ قدم قدم پر وہ واقعہ اس کی نگاہوں کے سامنے تیر جاتا جب

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اسے فرانس کے ایک گاؤں میں لیوسی ملی تھی۔ لیوسی نے اسے دو چار دن ذرا غور سے دیکھا تھا اور ایک روز گلی کے موڑ پر ٹوٹی پھوٹی فرانسیسی میں اس نے لیوسی کے گھر کا پتہ پوچھ لیا۔ اس رات وہ بارک سے کھسک کر لیوسی کے گھر کے قریب پہنچا۔ وہ کھڑکی میں سے سر نکالے اس کی راہ دیکھ رہی تھی۔ سیڑھیاں چڑھ کر وہ اس کے پاس آیا۔پاؤں کے انگوٹھے سے لے کر ماتھے کی آخری لکیر تک سنگ مرمر میں ڈھلی ہوئی حسن و نزاکت کی پتلی لیوسی —— بڑی بڑی نیلی آنکھیں مٹکاتی —— لمبی خمیدہ پلکیں جھپکاتی —— سنہرے ملائم بال نیلی مہین رگوں کے جال میں پھنسے ہوئے سرخ و سپید گالوں پر بکھیرتی اور مرمریں گردن میں ایک مبہم سا خم ڈالتی اس کی طرف بڑھی اور اپنی گوری گوری بھری بھری باہیں اس کی گردن کے گرد لپیٹ دیں۔ اپنے لب اس کے لبوں پر کچھ ایسے انداز سے رکھے کہ اس کا دل پسلیوں سے ہمک کر اس کے حلق میں اٹک گیا اور صبح کو اسے لیوسی نے جگا کر کہا۔ ”جاؤ جاؤ' دن چڑھ آیا ہے بگل کب کا بج چکا ہے' جاؤ!“

اپنے مختصر قیام کے دوران میں وہ لیوسی کے پاس بلا ناغہ آتا رہا اور جب سال کے بعد ہندوستانی فوجیں پھر اسی گاؤں میں واپس آئیں تو وہ لیوسی کی تلاش میں سارے گاؤں اور گاؤں سے باہر چراگاہوں کی خاک چھانتا پھرا اور آخر اسے ایک بڑھیا کی زبانی یہ سن کر بے حد افسوس ہوا کہ ”مس لیوسی اپنا تین ماہ کا بچہ لے کر پیرس چلی گئی ہے اور وہاں اتحادی فوجوں کے لیے صابن بنانے والے کارخانے میں کام کرتی ہے۔“

لیوسی کا خیال آتے ہی اس کا دل ایک لمحے کے لیے سکڑ جاتا' لیکن یہ خیال کر کے اسے تسلی ہو جاتی کہ اس راز کو لیوسی اور اس کے سوا کوئی نہیں جانتا۔

اور اب وہ تین سال زندگی اور موت کے کڑے امتحانوں سے گزر کر

www.iqbalkalmati.blogspot.com

دو مہینے کی چھٹی پر گھر واپس آ رہا تھا۔ جنگ ختم ہو چکی تھی۔ اسے گزشتہ تین برس کی تنخواہ مل گئی تھی۔ اور چھ سو روپے یکمشت حاصل کر کے اسے یوں محسوس ہوا جیسے انگریزوں نے اپنے سارے خزانوں کی تھیلیاں اس کی جھولی میں الٹ دی ہیں۔

اسٹیشن پر اتر کر اس نے سنتروں اور کیلوں کا ایک بہت بڑا ٹوکرا خریدا۔ ریوڑیوں اور جلیبیوں کی ایک گٹھڑی باندھ لی۔ ایک نیا صندوق خریدا جس پر سبز پھولوں اور سرخ طوطوں کی رنگین تصویریں بنی ہوئی تھیں۔ بیوی کے لیے ایک ایسا دوپٹہ خریدا جسے آٹھ بار بھی کسی چیز پر تہ کر کے رکھا جاتا تو یوں محسوس ہوتا جیسے شیشہ پڑا ہے۔ اپنے بچے کے لیے ایک قلم خریدا جس کے دوسرے سرے پر ایک پنسل اور پنسل کی دم میں ربڑ کا ننھا سا ٹکڑا جڑا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اس کی بیوی نے ننھے کو سکول بھیجنا شروع کر دیا ہو گا کیونکہ اسے دیکھ کر وہ اکثر کہا کرتی تھی۔ "میرا ننھا اچھی شکل کا نہیں ہے تو کیا ہوا ——— یہ تو مدرسے کا منشی بنے گا اور منشی ایسے ہی ہوا کرتے ہیں۔"

بیوی کے لیے سلمے ستارے والی جوتی اور منے کے لیے سفید پھندنے والی سرخ ٹوپی خریدی ——— اس نے سوچا کہ تین سال بعد اس کی بیوی اور منا خدا جانے کن کن نعمتوں کے امیدوار بیٹھے ہوں گے۔

بستر وہیں اسٹیشن پر اپنے گاؤں کے ایک قلی کے پاس رکھ کر اس نے پھلوں کے ٹوکرے، صندوق اور مٹھائی کی گٹھڑی کو کچھ اس سلیقے سے باندھا کہ سر پر اٹھاتے ہوئے اسے کوئی دقت پیش نہ آئی۔

سورج غروب ہو چکا تھا اور تارے آہستہ آہستہ آسمان کی گہری نیلی تہوں کے نیچے سے ابھر رہے تھے۔ چاند کی آخری تاریخیں تھیں اس لیے روشنی کی کوئی امید نہ تھی۔ اسے اپنے علاقے کی ننھی منھی پگڈنڈیوں کے جال اپنے ذہن پر چاند کی کرنوں کی طرح ابھرتے محسوس ہوئے اور وہ بے فکر چلتا

www.iqbalkalmati.blogspot.com

گیا۔ لیکن شاید دہقانوں نے پگڈنڈیوں کے رخ بدل ڈالے تھے۔ کئی بار وہ کیاریوں میں گھس گیا جو کنوئیں کے پانی سے لبریز تھیں۔ کئی مرتبہ گیہوں کے کھیت اس کی راہ میں حائل ہو گئے۔ کئی بار گول گول پتھروں کی حد بندیوں سے اس نے ٹھوکریں کھائیں۔ لیکن اسے اپنے بھٹک جانے میں بھی کیف سا محسوس ہوا۔ گیہوں کے بھیگے ہوئے پودوں کو چھو کر اسے اپنی جوانی کے دن یاد آگئے جب درانتی سے گھاس کاٹتے کاٹتے اس کے ہاتھوں پر سبز رنگ چڑھ جاتا تھا اور جب وہ گھاس کے گٹھے اٹھانے میں اول درجہ کا طاقتور نوجوان سمجھا جاتا تھا۔ گول گول پتھر جب اس کے ٹخنوں سے ٹکرا کر بجتے تو اسے اپنے بچپن کی وہ گھڑیاں یاد آجاتیں جب گائے اور بکریوں کے پیچھے دوڑتے دوڑتے اس کی پنڈلیاں دکھنے لگتی تھیں اور کنکر اڑ اڑ کر اس کی ایڑیوں اور ٹخنوں کو زخمی کر دیتے تھے اور جب تھک کر اور کسی پہاڑ کی کھوہ میں سوکھی لکڑی جلا کر وہ ایسے ایسے دوہے گاتا جن کا مطلب خود اسے معلوم نہ ہوتا تھا! ——— ان تصورات کے جلو میں لیوسی کا نازک پیکر تیز جھونکے کی طرح آتا اور اسے لمحہ بھر کے لیے جھنجھوڑ کر چلا جاتا۔

جب وہ اپنے گاؤں کے نزدیک پہنچا تو اسے صرف ایک جگہ دھندلی سے روشنی دکھائی دی اور وہ جی ہی جی میں کڑھنے لگا کہ اس کی بیوی کو کس کم بخت نے اطلاع دے دی کہ وہ جنگ پر سے واپس آرہا ہے! اس نے بہت بڑی گٹھڑی کو ایک تھکے ماندے شانے سے دوسرے تازہ دم شانے پر منتقل کرتے ہوئے جی میں کہا۔ "سارا مزا کرکرا ہو گیا۔ ساری لذت ملیا میٹ ہو گئی!" ——— اس کی آدھی خوشیوں پر بچوں کے نیلے پیلے غباروں کی سی جھریاں پڑ گئیں جن میں سے تھوڑی سی ہوا نکل گئی ہو۔!

جب اس نے اپنے گاؤں کی پہلی گلی میں قدم دھرا تو ایک گول سا پتھر ڈھلان سے لڑھکتا ٹخ ٹخ بجتا کھائی میں گر گیا اور پتھر کا شور سن کر قریب ہی ایک

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کتا تڑپ کر اٹھا۔ اور اس زور سے بھونکا کہ سوئے ہوئے پہاڑ جاگ اٹھے اور گاؤں کے مشرق سے مغرب تک سے ننھے پلوں سے لے کر بڑے بوڑھوں تک سب کتے بلبلا اٹھے تو اس نے سمجھا کہ اس کا راز فاش ہو گیا ہے اور جیسے مکانوں کی منڈیریں اسکی طرف سر ہلا ہلا کر دیکھتی ہیں اور کہتی ہیں۔ "ہوں چھپ چھپ کر آتے ہو! ——— تم سن چودہ کی لام سے واپس آرہے ہو۔ تمھاری بیوی نے سویاں پکا رکھی ہیں۔ تمہارا بچہ تمہارا حقہ تازہ کر رہا ہے۔ تمہارے خاندان کی عورتیں چھتوں پر بیٹھی اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر تمہیں ڈھونڈھ رہی ہیں۔ تم ہم سے چھپتے ہو؟ ——— ہوں؟"

دیواروں سے لگ کر چلتا تیز تیز قدم اٹھاتا جب وہ مسجد کے قریب سے گزرا تو اسے یہ دیکھ کر بہت افسوس ہوا کہ مسجد کا ایک مینار گر گیا ہے اور مولوی جی جو اس وقت نماز پڑھا رہے تھے' بہت بوڑھے ہو چکے ہیں۔ دیئے کی پیلی روشنی ان کی سفید برق ڈاڑھی پر پڑ رہی تھی اور جب انہوں نے اللہ اکبر کہا تو اس نے محسوس کیا کہ ان کی بتیسی بھی جھڑ چکی ہے اور ان کی سریلی آواز پرانی سارنگی کی اس بے ہنگم تان میں تبدیل ہو چکی ہے جو اس کے آخری ڈھیلے ڈھالے تار سے بے خبری میں نکل گئی ہو!۔

مسجد کا دیا دیکھ کر اس کی خوشیاں پھر نئی شان سے ابھریں۔ ان نیلے پیلے غباروں میں پھر کسی نے ہوا بھر دی۔ اس کا گھر مسجد کے قریب ہی تو تھا۔ ایک میل دور سے اگر اسے مسجد کا دھوکا ہوا تو یہ کوئی اچنبھے کی بات نہ تھی۔ اندھیرے میں نظریں بھٹک ہی جاتی ہیں اور پھر تین سال کا پھیر ہے۔ تین دونوں کا تو نہیں کہ قیاس حرف بحرف سچ نکلے۔

وہ اپنے گھر کے دروازے سے دو قدم کے فاصلے پر ہی ہو گا کہ ایک شخص اس کے قریب سے "السلام علیکم" کہہ کر گزر گیا۔ اسے معلوم تھا کہ جواب دینے میں چالیس دنوں کی نماز کا ثواب ہے۔ لیکن وہ صرف اس لیے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

خاموش رہا کہ اسے اپنے راز کے فاش ہو جانے کا ڈر تھا۔ جس جذبے کو اپنے سینے میں چھپا کر وہ میسوپوٹیمیا سے روانہ ہوا تھا' اسے ذرا سی آواز نکال کر وہ خاک میں کیونکر ملا دیتا۔

اس نے اپنے مکان کا دروازہ بے حد احتیاط سے کھولا۔ خشک لکڑی کا مس بجلی کی طرح اس کے قلب کی طرف دوڑا۔ وہ سر سے پاؤں تک لرز گیا۔ گٹھڑی سر سے اتار کر وہ پاگلوں کی طرح دروازے سے لپٹ گیا ——— اس کا پرانا دوست مدتوں کا خاموش ساتھی۔ جس کی آڑ لے کر اس نے شادی سے قبل گاؤں کی ہر لڑکی کو جی بھر کر دیکھا اور جس کے پیچھے چھپ کر اس نے اپنی بیوی پر چھاچھ کی کلی کر دی تھی۔ گٹھڑی ہاتھ میں لٹکا کر اس نے دروازہ بند کر دیا اور آگے بڑھا۔ مکان کے صحن میں دو چار چارپائیاں بچھی تھیں۔ چوروں کی طرح دبے پاؤں وہ چارپائیوں کے قریب گیا ایک خالی تھی اور دوسری پر اس کا بچہ سو رہا تھا۔ ایک بار اس نے صحن کا چکر کاٹا اور جب اسے یقین ہو گیا کہ اس کی بیوی کہیں پڑوس میں ہے تو وہ بڑھ کر اپنے بچے کے پاس گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔ دھیرے سے بولا۔ "میرے بچے' میرے بچے!" وفور مسرت سے اس کا گلا گھٹ گیا اور آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔ آسمان پر ننھے ننھے تارے جیسے کروٹیں سی بدلنے لگے اور پڑوس میں کوئی بوڑھی بکری اپنی پھٹی پھٹی آواز میں یوں ممیائی جیسے پکار رہی ہے "امیر خان ——— ہو امیر خان!"

مسکرا کر اس نے جیب سے دیا سلائی کی ڈبیہ نکالی۔ دیا سلائی روشن کرنے سے پہلے اس کا لڑکا بے شمار صورتیں اختیار کر کے اس کے تصور پر منڈلانے لگا۔ ——— تین سال اور چھ سال کی عمر میں بچے کی شکل و صورت میں جو تبدیلیاں ہوتی ہیں' سب بجلی کی سی تیزی کے ساتھ اس کے دماغ کی سلوٹوں میں رینگنے لگیں اور جب دیا سلائی کی رگڑ سے چھرررر کی آواز پیدا ہوئی تو جیسے اس کے دل کو کسی نے مٹھی میں دبا کر نچوڑ ڈالا۔ تھن تھنا چہرہ' موٹے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

موٹے ہونٹ' لٹکے ہوئے گال' چوڑی ناک' تنگ ماتھا' ذرا سی گردن ———
"میرا بچہ!" ——— اس نے سرگوشی کی اور جب وہ اسے چومنے کے لیے اتنی بے شمار پیاری چیزوں میں سے ایک جگہ کا انتخاب کرنے لگا تو بچے کے دائیں گال پر ناک سے لے کر کان تک اسے ایک سانولی سی لکیر نظر آئی۔ دیا سلائی بجھ گئی اور اسے وہ دن یاد آگیا جب اس کی بیوی بیمار تھی اور وہ خود چھری لے کر شلغم چھیلنے لگا۔ اس کی بیوی یہ برداشت نہ کر سکی۔ کھاٹ سے اتر کر چھری اس کے ہاتھ سے چھیننا چاہی تو پاس ہی منا بیٹھا تھا' اس کے گال پر جا لگی اور خون کی ایک تیز دھار اس کے گلے سے ہوتی ہوئی اس کے ابھرے ہوئے پیٹ' پھولی ہوئی رانوں اور گتھی ہوئی پنڈلیوں سے گزرتی' ایڑی پر پڑنے لگی تھی۔ اس کی بیوی نے دس سیر سوجی کے حلوے کی منت مانی تھی اور جب ننھا اچھا ہو گیا تو اس نے دس سیر سوجی کا حلوہ پکانے کے لیے نمبردار کے گھر سے بڑا دیگچہ منگوایا۔ اور جب فقیر سائیں کی خانقاہ پر جانے کے لیے اس نے میراثن کو بلوایا اور دیگچہ اس کے سر پر دھرا تو وہ مسخری دو ایک بار لڑکھڑائی اور چلا اٹھی
'ہائیں' مجھ نگوڑی کو یہ معلوم نہ تھا کہ سوجی کا حلوہ بھی کمر توڑ ڈالتا ہے۔"

اب اس نے جھک کر اس سانولی لکیر پر اپنے خشک ہونٹ رکھ دیئے اور بچے نے نیند میں انگڑائی لیتے ہوئے اس کے منہ پر ایک ننھا سا طمانچہ لگا دیا۔
——— قہقہہ ضبط کرنے کے لیے اس نے اپنا سر گھٹنوں میں گھسیڑ دیا۔ اٹھ کر سرکنڈے کے چھپر تلے آگیا جہاں گٹھڑی پڑی تھی۔ صندوق کا کنڈا کھول کر مہین دوپٹے' سلمے ستارے والی جوتی' اور سفید پھندنے والی ٹوپی کو چھوا ——— پھلوں کا ٹوکرا اٹھا کر ایک طرف رکھا۔ مٹھائیوں کی گٹھڑی صندوق پر دھر دی۔ روپوں کی پوٹلی پر ایسے ہی ہاتھ پھیرا اور یوں اکڑ کر کھڑا ہو گیا جیسے وہ نئی دنیا سے ایسی ایسی چیزیں لے کر آیا ہے جن کا آج تک گاؤں والوں میں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

سے کسی نے نام تک نہیں سنا!

صحن میں نظریں دوڑاتے ہوئے اسے پہلے بار محسوس ہوا کہ اس کا دل غیر معمولی تیزی سے دھڑک رہا ہے۔ اسکے کان دل کی دھک دھک سننے لگے اور پھر یہ دھمک صحن میں گھومنے لگی ——— اوپر فضا میں اٹھ گئی ——— کائنات میں پھیل گئی ——— اندھیرے سے چھن کر ستاروں میں سما گئی ——— زمین و آسمان اس کے دل کی دھڑکن کے تال پر ناچنے لگے۔ وہ بے قرار ہو گیا جیسے اس کا بہت بڑا راز فاش ہونے والا ہے!

اچانک بھنچا ہوا دروازہ چرخ سے کھلا اور اس کی بیوی صحن میں داخل ہوئی۔ اس کے دل کی دھک دھک اچانک رک گئی جیسے گاڑی کا انجن جنگلوں میں اور پہاڑوں میں دندناتا ہوا یکایک تھم گیا ہو۔ ——— ! ایک قلا بازی کھا کر کوئی چیز اس کی پسلیوں سے ٹکرائی اور وہ پھولی ہوئی سانس پر قابو پانے کی کوشش میں بیٹھ گیا۔ اس کا دماغ تپنے لگا! اس کے ہونٹ پھڑکنے لگے! ——— رونگٹے اس کے جسم پر چیونٹیوں کی طرح سرسرانے لگے! اس نے اپنی انگلی دانتوں میں بڑے زور سے دبائی۔ مگر اسے کوئی درد محسوس نہ ہوا جیسے وہ کسی لکڑی کو چبا رہا ہے!

اس کی بیوی نے دیوار کے اندر پڑا ہوا دیا روشن کیا اور ایک لمحے کے لیے امیر خان کو ایسا محسوس ہوا کہ بیتے ہوئے دن اور تمام گھڑیاں دیئے کی لو میں ٹمٹمانے لگی ہیں ——— لیوسی کی آنکھوں کی چمک بھی اس لرزتی ہوئی لو میں جھلک رہی تھی!

تین برس! ——— جن کے خدا جانے کتنے دن ہوتے ہیں، اپنے تمام موسموں سمیت اس کے اور اس کی بیوی کے درمیان کھڑے ہو گئے۔ تین برس! اسے معلوم نہ تھا کہ ایک ایک برس اتنی موٹی دیوار چن سکتا ہے!

امیر خان نے ان تین برسوں میں سے اپنی بیوی کی طرف دیکھا ———

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہائیں! یہ کیا! ——— امیر خان کا ہاتھ اپنے گٹھڑی کی طرف بڑھا ——— اس کی بیوی کے انگ پر ریشمی قمیض تھی اور دوپٹہ ——— دوپٹہ! ——— اس کا ہاتھ پھر اپنی گٹھڑی کی طرف بڑھا! ——— اس کی بیوی کے مہین دوپٹے میں سے اس کے بالوں کی سیاہی باہر نکل رہی تھی۔ امیر خان کو وہ دن یاد آگئے جب وہ بیری کے پتے گھوٹ گھوٹ کر بالوں میں لگایا کرتی تھی اور اس سے کہا کرتی تھیں۔ "میرے بال اتنے لمبے ہو جائیں گے اتنے لمبے ہو جائیں گے کہ تم دیکھا ہی کرو گے!" ——— اور اب امیر خاں ان بالوں کو دیکھتا ہی رہ گیا۔ کیونکہ اس کے بال واقعی بہت لمبے تھے اور جو دوپٹہ وہ اوڑھے ہوئے تھی اس کو بھی آٹھ بار تہ کر کے کسی چیز پر رکھا جاتا تو یوں معلوم ہوتا، جیسے شیشہ پڑا ہے!

چرچراہٹ ہوئی اور امیر خاں کی آنکھیں جو ابھی تک تین برسوں کے اندر برمے کی طرح سوراخ کر رہی تھیں، اپنی بیوی کے پاؤں پر پڑیں ——— اس کا ہاتھ پھر اپنی گٹھڑی کی طرف اٹھ گیا ——— سلمے ستارے کی جوتی اس کے پاؤں میں تھی اور۔ دیئے کے اس طرف ایک کھونٹی کے ساتھ سفید پھندنے والی سرخ ٹوپی لٹک رہی تھی ——— وہ آنکھیں میچ کر جھک گیا اور ہاتھ فرش پر ٹیک دیئے ——— کوئی چیز اس کی انگلیوں سے مس ہوئی۔ یہ سنترے یا کیلے کا ایک چھلکا تھا۔ اس نے وہ سوکھا ہوا چھلکا اٹھا کر یوں پھینک دیا جیسے قصائی گوشت پر سے چھچھڑا اتار کر اڑا دیتا ہے۔! چھلکا اندھیرے میں مٹی کے کسی برتن سے ٹکرایا ——— آہٹ ہوئی! ——— اس کی بیوی ایک دم چونکی! امیر خان نے جو کہ ابھی اس چھلکے کی گرفت انگلیوں میں محسوس کر رہا تھا، جیب میں ہاتھ ڈالا اور روپوں کی پوٹلی کو چھوا ——— اس کی بیوی آہٹ کی جستجو میں بڑھی ——— سمٹی! ——— اس کے شیشے ایسے دوپٹے کا ایک کونہ جس میں کچھ بندھا تھا، پھسل کر نیچے گرا ——— ہلکی سی چھنن کی آواز آئی ——— امیر خان نے جیب میں اپنے روپوں کی پوٹلی پر سے اس وحشت سے انگلیاں اٹھائیں جیسے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اسے بیشمار سانپوں نے بیک وقت ڈس لیا ہے!

اس کی بیوی نے جھٹ سے دوپٹے کا وہ کونہ اپنے نیفے میں اڑس لیا اور کوٹھڑی کی طرف بڑھی وہ اندھیرے میں ڈوب گئی اور تین برس پھر امیر خاں کی چوڑی چھاتی پر سوار ہو کر ناچنے لگے۔

اس کی نگاہیں اپنے بچے' اس کے چہرے کی سانولی لکیر' کیلے اور سنتروں کے بکھرے ہوئے چھلکوں اور سفید پھندنے والی ٹوپی دیکھ رہی تھیں۔ مگر ان چیزوں کا نقش اس کے دماغ پر نہیں بیٹھتا تھا۔ اسے ایسا محسوس ہوتا تھا گویا وہ برف کے ڈھیلے پر لکیریں کھینچ رہا ہے۔!

جماہی کی اونچی آواز آئی۔ امیر خاں نے کوٹھری کے دروازے کی طرف دیکھا۔ اسے معلوم ہوا جیسے دروازہ ابھی تک منہ کھولے جمائی لے رہا ہے۔ اس نے تین برسوں کے شور و غل میں اپنی سماعت پر زور دے کر کچھ سننا چاہا —— کچھ —— ایک پتلی دبی دبی آواز آئی۔ "جاؤ' دن چڑھ آیا ہے' مرغ کب کے بانگیں دے چکے —— جاؤ۔"

امیر خاں نے ادھر ادھر دیکھا کہ امیر خاں کدھر ہے —— اور یہ امیر خاں کا گھر ہے یا لیوسی کا مکان اور یہ اس کی بیوی کی آواز ہے یا لیوسی کی —— یہ کون ہے اور یہ کسے مخاطب کیا گیا ہے اور —— اور وہ کیا سوچ رہا ہے —— وہ ——! کچھ نہیں —— کچھ نہیں!

اندر سے پھر ایک تیز آواز تیرتی ہوئی آئی اور اس کے کانوں میں کنکھجورے کی طرح گھس گئی۔ "اٹھو' میں دیکھ آئی ہوں۔ نمبردار کا دروازہ بند ہے —— اب نکلو بھی یہاں سے —— نگوڑا پتہ بھی کھڑکے تو میں اچھل پڑتی ہوں —— جاؤ' جاؤ بھی۔ پر یاد رہے کل منے کے لیے ریوڑیاں اور جلیبیاں ضرور لیتے آنا۔"

امیر خاں نے روپوں کی پوٹلی نکال کر ریوڑیوں کی گٹھڑی پر دھر دی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

لیکن ایک دم اس نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ اسے ایسا محسوس ہوا کہ ہاتھ کے دباؤ سے ریوڑیاں کڑکڑ بولنے لگی ہیں!

اس کا دماغ آگ کی دہکتی ہوئی بھٹی بن گیا۔ دیوار سے چمٹتا وہ باہر کھسکنے لگا اور دروازے کی اوٹ میں ہو کر اس نے دیکھا کہ کوٹھڑی سے اندھیرے میں ایک بھیگا ہوا آدمی باہر نکلا۔ امیر خاں کے تین برس کے واقعات سے بھری ہوئی آنکھوں کے سامنے اس نے انگڑائی لی اور کہا۔ "لے آؤ نگا۔ پہلے کبھی انکار کیا ہے۔ کہ اب اتنی تاکید کر رہی ہو!"

منے کی طرف دیکھ کر وہ مسکرایا اور زیر لب کہنے لگا۔ "امیر خاں سے اس کی شکل کتنی ملتی جلتی ہے۔"

امیر خاں کی بیوی نے بڑھ کر اپنے بچے کی سانولی لکیر پر اپنے لب رکھ دیئے اور بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ "امیر خاں سے تیری شکل سچ مچ کتنی ملتی ہے" ——— امیر خاں نے دیئے کی دھندلی روشنی میں اپنی بیوی کے دائیں گال پر پانی کی ایک پتلی سی سانولی لکیر دیکھی۔ وہ وحشیوں کی طرح لپک کر باہر گلی میں آگیا! گلی کے نکڑ پر اچانک اس کے جسم میں تھرتھری دوڑ گئی۔ فرانس کے گاؤں کا وہ نکڑ اسے یاد آگیا جہاں اس نے ٹوٹی پھوٹی فرانسیسی میں لیوسی سے اس کے گھر کا پتہ پوچھا تھا۔

وہ سر جھکائے چلا جا رہا تھا کہ ایک شخص اس کے قریب سے گزرا۔ امیر خاں نے کہا ——— "السلام علیکم" جانے والا تیورا کر پیچھے ہٹا اور سلام کا جواب دیئے بغیر نمبردار کے مکان کے سامنے سے دبے پاؤں گزرتا ایک گلی میں غائب ہو گیا۔

✽ ✽ ✽

www.iqbalkalmati.blogspot.com

خوش رہو

کشتی کنارے لگی۔ میں ملاحوں کو جی ہی جی میں ہزار صلواتیں سناتا خشکی پر آرہا اور تھیلا ہاتھ میں لٹکا کر پگڈنڈی پر ہو لیا۔

گرمیوں کی رخصتیں تھیں اور میں ایک عزیز دوست کے ہاں جا رہا تھا جو دریا کے کنارے سے آٹھ میل دور ایک قصبے میں رہتا تھا۔ میں نے اسے اپنی آمد کی اطلاع نہیں دے رکھی تھی ورنہ کسی سواری کا انتظام ہو جاتا۔ دراصل میں نے اسے اپنی آمد سے متعجب کرنا چاہتا تھا۔ گاڑی تو اسٹیشن پر دو بجے ہی پہنچ گئی اور میں ڈھائی بجے کشتی پر سوار ہو گیا لیکن دریا چڑھاؤ پر تھا اور ملاحوں کے لمبے لمبے چپو جھاگ اگلتی ہوئی موجوں کی تیز رفتاری کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ کشتی کبھی اِدھر مڑ جاتی تھی کبھی اُدھر۔ چپو پانی میں یوں غوطوں پر غوطے لگا رہے تھے جیسے کوئی جاندار چیز ہو اور لپک لپک کر موجوں کو کاٹ کھانا چاہتی ہو۔ سب مسافر بھیگ گئے تھے اور چار بجے ہمیں یہ سن کر بہت رنج ہوا کہ جائے روانگی سے چند میل آگے جانے کے بجائے ایک میل مخالف سمت کی طرف ہٹ آئے ہیں۔ آخر کنارے سے دو ملاح مدد کے لیے بلائے گئے۔ کشتی میں چند

www.iqbalkalmati.blogspot.com

نوجوان مسافروں نے بھی زور لگایا اور بصد مشکل سب کی متفقہ کوششوں سے کشتی کنارے پر آ لگی۔

اب میں دن چھپنے سے پہلی قصبے میں نہیں پہنچ سکتا تھا لیکن پست قد گنجان جھاڑیوں سے پٹے ہوئے اس جنگل میں کوئی ایسی آبادی بھی نہ تھی کہ میں وہاں رات بسر کر سکتا۔خدا کا نام لیا اور تیز تیز قدم اٹھاتا پگڈنڈی پر اڑنے لگا۔

اچانک مجھے پیچھے سے کسی نے آواز دی۔ "ٹھہر جاؤ!"

میں گھبرا کر رک گیا۔پلٹ کر دیکھا تو گھاٹ پر پولیس کے چار سپاہی کھڑے مجھے اپنی طرف بلا رہے تھے میری سنہری عینک اور نکھرا ہوا رنگ دیکھ کر سہم گئے اور ان میں سے ایک بولا۔ "آپ جا سکتے ہیں، غلطی ہوئی ہم سے؟"

لاحول ولا قوۃ! یہ کیا مذاق ہے! لیکن مجھے چراغ جلتے قصبے میں پہنچنا تھا اور پولیس والوں کی اس غیر قانونی مداخلت پر دانت پیسنے کا میرے پاس وقت نہ تھا۔ میں نے پلٹ کر اپنی راہ لی اور نہایت تیزی سے سفر شروع کیا۔

آسمان پر بادل گھرے ہوئے تھے اور دور افق پر گاہے گاہے بجلی چمک اٹھتی تھی۔ ہوا نمی سے بوجھل ہو رہی تھی اور تمام منظر جیسے بارش کا منتظر کھڑا تھا۔ میرے قدم اس خیال سے اور تیز ہو گئے کہ اگر اس ویرانے میں بارش شروع ہو گئی تو عجب نہیں کہ سردی سے ٹھٹھر کر اکڑ جاؤں، یا کسی برساتی نالے کی زد میں آکر کسی چٹان سے ٹکرا کر مر جاؤں۔ میں کوئی چار میل طے کر آیا ہوں گا کہ اچانک بونداباندی شروع ہو گئی اور آس پاس فصلوں پر بوندیں ٹپا ٹپ ایک مسلسل راگ الاپنے لگیں۔ کھیتوں کے کناروں پر آک کے خشک پتے زور زور سے کھڑکھڑانے لگے۔ میں خوفزدہ سا ہو گیا۔مجھے بھوتوں اور دیگر غیر مرئی ارواح پر کوئی یقین نہیں لیکن اب میں محسوس کرنے لگا جیسے ساری کائنات

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ارواح خبیثہ کے قبضے میں ہے اور جیسے وہ کھیتوں کے کنارے پودوں کی آڑ میں مجھ پر تالیاں بجا رہی ہیں اور مجھے پھانس لینے کے متعلق سرگوشیاں کر رہی ہیں۔ خوف نے میرے عقب میں کسی کے پاؤں کی چاپ بھی پیدا کر دی۔ بہت دیر تک میں نے پیچھے مڑ کر نہ دیکھا لیکن جب خوف کی آخری حد پر پہنچ کر محسوس کیا کہ میرا گلا اینٹھ رہا ہے تو آپ سے آپ میری گردن مڑ گئی۔ اچانک بجلی پوری شدت سے چمکی اور دور ایک کبڑا ٹھنٹھ پگڈنڈی کے عین درمیان ظاہر ہوا اور اندھیرے میں جذب ہو گیا۔ اس کے بعد بادل اس زور سے گرجا جیسے پہاڑ کروٹ بدل رہے ہیں!

میں اقبال کے شعر گنگنانے لگا۔:

؎ اگر خواہی حیات اندر خطر زی!

لیکن میری ہراساں گنگناہٹ میرے لیے مصیبت بن گئی۔ مجھے خود اپنی آہٹ پر کسی بھوت کی آواز کا گمان ہونے لگا۔ میں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف دیکھنا شروع کیا لیکن گھٹا ٹوپ اندھیرے میں مجھے خود اپنا وجود نظر نہیں آتا تھا۔

اچانک مجھے راہ کی بائیں جانب ایک دیا سا ٹمٹماتا دکھائی دیا۔ یہ شاید ایک جھونپڑی تھی جس کے دروازے پر ایک بے حس و حرکت سایہ کھڑا تھا۔ میں نے وہیں سے پھیپھڑوں کی پوری قوت سے آواز دی۔ ”کیا مسافر کو رات گزارنے کے لیے کوئی کونا کھدرا مل سکے گا؟“

سائے میں حرکت ہوئی۔ ایک اور سایہ فرش پر سے ابھرا اور دوسرے کے قریب ہو کر پھر جدا ہو گیا۔

”آ جاؤ“ ـــــ آواز میں بڑھاپا تھا۔

اب گنجان اور موٹی موٹی بوندیں گرنے لگیں۔ میں جھونپڑی کی طرف بھاگا اور دروازے کے پاس پہنچ کر رک گیا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اندر آجاؤ۔"

میں اندر چلا گیا۔

یہ ایک بہت بوڑھی عورت تھی۔ اس کے بال کھچڑی ہو چکے تھے اور چہرے کی جھریوں کا انجام اور آغاز معلوم نہیں ہوتا تھا۔ اس کے لبوں پر مسکراہٹ تھی۔ اس کے سارے جسم پر رعشہ تھا اور سر تو بار بار رعشے کی شدت سے ادھر ادھر جھک جھک جاتا تھا۔ "تم کہاں سے آرہے ہو مسافر بیٹا؟" اس نے کانپتی آواز میں مجھ سے پوچھا۔

"گھاٹ سے۔" میں نے تھیلا فرش پر رکھتے ہوئے کہا۔

"گھاٹ سے؟ کشتی آگئی ہے کیا؟ اے شیدو۔ کشتی گھاٹ پر آگئی۔ یہ مسافر وہیں سے اتر کر آرہا ہے۔"

ایک لڑکی دیوار سے لگ کر کھڑی تھی۔ میں نے اس کی طرف دیکھا تو اس کے چہرے پر شفق سی پھول کر رہ گئی۔ اس نے لجا کر نیچے جو د تو میں سمجھا آسمان اپنے ستاروں سمیت زمین پر آرہا ہے۔ یونہی نیچی نظریں کئے وہ بولی۔ "مگر امی بھیا نہ آیا۔"

"آرہا ہوگا۔ یہ مسافر تو بہت تیز آرہا ہے۔ ہانپ رہا ہے بیچارہ۔ گھبرا گیا ہے بارش سے۔ اسے کھاٹ پر چادر ڈال دے۔ اے میاں مسافر آرام کرو تم۔ ہم تو آج رات جاگتے رہیں گے۔ آج میرا بیٹا آرہا ہے!"

کتنی معصومیت اور کتنی محبت تھی ان دونوں کے انتظار میں! کتنا خلوص تھا ان دو پاکیزہ سینوں میں۔ "میرا بیٹا آرہا ہے۔" "میرا بھیا آرہا ہے!" زندگی بھی عجیب چیز ہے۔یہ آرزوئیں' یہ امیدیں' یہ انتظار' کبھی وہ یہاں سے پردیس سدھارا ہوگا۔ ان کی آنکھیں بھیگ گئی ہوں گی۔ پھر راتوں کو انہوں نے سر بسجود ہو کر دعائیں مانگی ہوں گی۔ نذریں دی ہوں گی۔ پیر جی کے پاؤں چومے ہوں گے۔ سنیاسیوں سے پترے پھنکوائے ہوں گے۔ بزرگوں کے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

مزاروں پر رنگ دار کھدر کے غلاف چڑھائے ہوں گے۔ ”میرا بیٹا جیتا رہے۔“ ”میرا بھیا دولہا بنے۔“ اور آج اس کی واپسی کا دن ہے۔ وقت اپنی تیزی کو کیسے کیسے بوقلموں پردوں میں چھپائے بیتا جا رہا ہے۔

”کھانا کھاؤ گے میاں مسافر؟“ بڑھیا نے پوچھا۔

لیکن میرے پاس کھانے کا کافی سامان موجود تھا۔ میں نے شکریہ ادا کیا۔ تھیلا کھولا' ڈبل روٹی اور آم کے مربے سے خوب سیر ہوا۔ کوٹ ایک طرف برتنوں پر ڈال دیا۔ ٹوپی لکڑیوں کے ایک ڈھیر پر رکھ دی اور کھاٹ پر ہو بیٹھا۔ شیدو نے چادر بچھا دی تھی۔ اس دوران میں اس نے اپنے سارے جسم کے اردگرد کچھ ایسے طریقے سے دوپٹہ لپیٹ لیا تھا کہ مجھے اس کی آنکھوں کے سوا اور کچھ نظر نہ آیا اور اس کی آنکھیں تاروں کی طرح چمک رہی تھیں۔ ایک بار دروازے کی طرف مڑتے ہوئے ان میں دیئے کا جو عکس پڑا تو میں سمجھا باہر بجلی چمک اٹھی ہے۔

میں نے بڑھیا سے پوچھا۔ ”ماں کہاں گیا ہے تیرا بیٹا؟“

بڑھیا اسی طرح باہر دیکھتی ہوئی بولی۔ ”مزدوری کرنے بیٹا۔ وہ کوئٹے میں مزدوری کرنے گیا تھا۔ چار سال ہوئے کوئٹے میں بڑی آفت آئی تھی۔ تم نے سنا ہو گا۔ سارا شہر زمین پر بچھ کر رہ گیا۔ ہم سے آدھ میل دور ایک گاؤں ہے۔ وہاں کے نمبردار نے ہمیں بتایا کہ کوئٹے میں مزدوروں کی ضرورت ہے' بیٹا گبرو تھا۔ رضامند ہو گیا۔ مجھے بھی اس کے بیاہ کے لیے کچھ رقم کی ضرورت تھی۔ اللہ کا نام لے کر چل دیا۔ وہاں دو سال کاٹ کر آ رہا ہے۔ ہر مہینے دس روپے بھیجتا رہا ہے۔ میں نے پچھلے سال گاؤں میں ایک لڑکی بھی ڈھونڈ نکالی۔ خوبصورت اور سگھڑ۔ کپڑے پر یوں پھول کاڑھتی ہے جیسے کسی نے سچ مچ کا پھول توڑ کر دھر دیا ہو۔ اس کے ماں باپ نے جو سنا کہ نواز آنے والا ہے تو کہنے لگے کہ بیاہ کی تاریخ مقرر کرو۔ میں نے کہا وہ آئے گا۔ کچھ روز آرام کرے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

گا۔ پھر تسلی سے سب کچھ ہو جائے گا۔ کہنے لگے نہیں جو بات کل ضرور ہونی ہے' وہ آج ہی کیوں نہ ہو جائے۔ انہوں نے تو کل کی تاریخ مقرر کر دی۔ میں نے چیخ پکار کر پرسوں کا دن منوایا ہے۔ ہفتہ سے ہمارے ہاں گاؤں کی لڑکیاں آ رہی ہیں۔ رات بھر گانے گائے جاتے ہیں' ناچ ہوتے ہیں' ڈھولک پر جو تھاپ پڑتی ہے' تو پوپھٹے تک کسی کو خبر نہیں ہوتی کہ چاند ڈوب گیا اور تارے ماند پڑ گئے۔ پھر جو یہ تھک کر سوتی ہیں تو بیٹا میں انہیں دیکھ کر بہت ہنستی ہوں۔ ایک کا سر دوسری کی ٹانگوں پر ہے تو دوسرے کی ٹانگیں تیسری کے سر پر! بس ٹانگوں' باہوں اور بالوں کا جال بچھ جاتا ہے۔ پرسوں آدھی رات کو دیئے کا تیل ختم ہو گیا۔ بتی اوپر چڑھاتی گئیں۔ ساری بتی راکھ ہو گئی۔ اندھیرا چھا گیا پر ڈھولک اسی طرح بجتی رہی۔ اندھیرے میں ناچ بھی ہوا۔ آج رات بارش کی وجہ سے نہیں آسکیں۔ ہم نے کپڑے تیار کر رکھے ہیں۔ گندم خرید لی ہے۔ کچھ زیور بھی بنوالیے ہیں۔ اری شیدو وہ چاندی کے کڑے تو میاں مسافر کو دکھا دے۔ ہائے ہائے تو تو سمٹی جا رہی ہے۔ اپنا بھائی ہے تیرا۔ شیدو تم سے شرما رہی ہے۔ مسافر بیٹا! پرسوں تم بھی نواز کی شادی دیکھ کر چلے جانا۔ ہمارے علاقے کا میراثی ایسی شہنائی بجاتا ہے کہ لاہور والے بھی سن لیں تو منہ میں انگلی ڈال لیں۔ ٹھہر سکو گے کل کا دن؟"

میں بڑھیا کی ہلکی پھلکی تقریر بغیر اکتائے سنتا رہا اور حیران ہوتا رہا کہ یہ بڑھیا جس نے تقریباً ستر سال اس جھونپڑی میں گزارے' شدت کی گرمیوں میں کھیتوں کی نگہبانی کی' سردی میں ٹھٹھرتی رہی' رنج بھوگے' مصیبتیں سہیں' آج یوں باتیں کر رہی ہے جیسے اس کے من پر ایک ذرا سی خراش تک بھی نہیں! امید کتنی بڑی ساحرہ ہے!

میں نے کہا۔ "ماں جی! مجھے قریب ہی ایک گاؤں میں جانا ہے۔ پرسوں شادی کے وقت میں ضرور یہاں پہنچ جاؤں گا۔"

www.iqbalkalmati.blogspot.com

وہ دروازے سے ہٹ آئی اور وفورِ مسرت میں اس زور سے ہنسی جیسے کوئی ٹین کے ڈبے میں پتھر ڈال کر کھڑکھڑائے۔ بولی۔ "ہے میرے بچے' تو کتنا اچھا ہے۔ ضرور آئیو اور میرے نواز کی گلابی رنگ کی واسکٹ پر سیپ کے ان گنت بٹنوں کی بہار دیکھیو جو شیدو نے خاص اس کے لیے تیار کی ہے!"

شیدو نے بھی کڑے نکالتے ہوئے مسکراتی ہوئی نظروں سے میرے طرف دیکھا اور میں سمجھا مجھ پر کسی نے چنبیلی کے پھولوں کی بارش برسا دی ہے!

میں نے کڑے انگلیوں میں گھماتے ہوئے کہا۔ "اوہ! بہت خوبصورت ہیں یہ کڑے۔ بہت اچھے ہیں۔ سنار نے غضب ڈھایا ہے۔ یہ نقش دیکھو۔ یہ پھول دیکھو۔ اور صفائی کیسی ہے ان میں۔ کیسے چمک رہے ہیں! کتنے بھاری ہیں! بڑی چاندی خرچ آئی ہو گی ان پر؟"

بڑھیا ہاتھ ملتے ہوئی بولی۔ "آدھ سیر' پوری آدھ سیر!" بڑھیا کی سانس پھول رہی تھی۔ "دو پاؤ۔"

"اللہ کرے تیری بہو سو سال تک سہاگن رہے!" میں نے کڑے واپس دیتے ہوئے کہا۔ شیدو نے اپنا دوپٹہ ڈھیلا کر دیا تھا۔ اب مجھے اس کا چہرہ نظر آ رہا تھا۔ صاف ستھرا جیسے مصفا جھیل پر پورے چاند کا عکس!

میں نے بھاری آواز میں کہا۔ "مجھے تو نیند آ رہی ہے۔ تم کب سوؤ گی؟"

"آج رات تو ہم نہیں سو سکیں گی۔ آج رات تو نواز آ رہا ہے۔"

میں مسکرایا۔ وہ دونوں دروازے پر کھڑی تھیں۔ میں آنکھیں بند کر کے سونے کی کوشش کرنے لگا مگر نیند کہاں۔ میں اتنے ہلکے پھلکے ماحول میں اپنے آپ کو ان دونوں کی مسرتوں سے بیگانہ نہ رکھ سکا۔

اور ابھی تک نواز کیوں نہیں آیا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

میں نے اپنی گھڑی کی طرف دیکھا۔ ڈیڑھ بج رہا تھا۔

میں بہت دیر تک کچھ سوچتا رہا' اور شاید اس دوران میری آنکھ بھی لگ گئی۔ میں نے محسوس کیا کہ نواز کھیتوں کی مینڈیروں پر سے پھلانگتا' جھاڑیوں پر سے کودتا' جھونپڑی کی طرف ہنستا ہوا بڑھا آرہا ہے! میں چارپائی پر اٹھ بیٹھا۔ دونوں اسی طرح دروازے پر دم بخود کھڑی تھیں۔

میں نے پوچھا۔ "نواز نہیں آیا؟"

"ابھی تک نہیں آیا۔"

"بارش بند ہو گئی؟"

"کب کی۔"

"نواز کیوں نہیں آسکا۔"

"خدا معلوم۔" بڑھیا دہلیز پر بیٹھ گئی۔ "شاید بارش کی وجہ سے رک گیا ہو۔"

شیدو بولی۔ "ہاں بادل خوب گرج رہا تھا!"

یہ دل کو تسکین دینے کے طریقے! اے اللہ! اے اللہ! زندگی بھی کتنا عجیب معمہ ہے!

مگر اسے اب تک آجانا چاہیے تھا! میں بہت دیر تک سوچتا رہا۔ آخر میں نے تہیہ کر لیا کہ اس کی تلاش میں ایک میل تک تو جاؤں گا۔ ان دونوں نے مجھے بہت روکا لیکن میں کھیتوں کو عبور کر کے پگڈنڈی پر آگیا جو اب ننھی سی ندی کی شکل اختیار کر چکی تھی۔ نصف چاند دور افق پر ہولے ہولے پیلا پڑ رہا تھا! اور کہیں کسی درخت پر کوئل اپنا غمگین نغمہ الاپ رہی تھی۔ میری ہلکی پھلکی روح پر ایک بوجھ سا آپڑا۔

میں نے پاگلوں کی طرح آوازیں دینا شروع کریں——"نواز—— او محمد نواز۔"

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ایک خرگوش ایک جھاڑی سے نکلا اور کھیتوں میں چھپ شپ کی آواز پیدا کرتا ہوا کسی اور جھاڑی میں گھس گیا۔

پگڈنڈی پر دور وہی کبڑا درخت کھڑا جیسے مجھے اپنی طرف کھینچ رہا تھا۔ میں خوفزدہ ہو کر واپس جھونپڑی کی طرف بھاگا۔ میں سمجھا درخت کے اس طرف بہت دور کوئی بہت مبہم سایہ حرکت میں ہے۔ میرے تو جیسے پر لگ گئے۔

دونوں سائے اسی طرح دروازے پر بے حس و حرکت کھڑے تھے!

مجھے خاموش دیکھ کر شاید ان کے دل دھک دھک کرنے لگے۔ کیونکہ دل کی ہر ضرب پر ان کا وجود دھیرے سے کانپ جاتا!

میں نے کہا۔ "اب تو پوپھٹنے کو آئی ہے۔ شاید وہ گھاٹ سے اب روانہ ہو۔ میں نے اسے بہت آوازیں دیں۔"

دونوں چپ کھڑی رہیں۔ آخر بڑھیا نے شیدو کو کہا۔ "تو جا کر حلوہ تو دیکھ ٹھنڈا نہ پڑ گیا ہو اور بیروں سے چیونٹیاں تو نہیں چمٹ گئیں۔ کھیر پر کوئی برتن رکھا تھا تو نے؟ کوئی ٹڈی نہ گر پڑے! نواز تیرا مذاق نہ اڑائے۔ چھوکریاں بھی تو نہ آئیں۔ ورنہ رونق رہتی۔ جی بہلا رہتا۔"

میں سر جھکائے بیٹھا رہا۔ دیا ٹمٹماتا رہا۔ مشرق کی طرف پوپھٹ رہی تھی۔ دونوں معصوم روحیں دروازے پر بے جان بتوں کی طرح کھڑی تھیں کہ اچانک ان میں حرکت ہوئی۔

"وہ کوئی آرہا ہے۔"

"وہ کھیتوں کے پار' پگڈنڈی پر۔"

میں بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ "کہاں؟ کہاں؟"

اب شیدو کا حجاب جانے کدھر غائب ہو گیا۔ میرا ہاتھ پکڑ کر دور اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ "وہ! وہ" —— میرا ہاتھ جو اس نے پکڑا تو میں سمجھا' بجلی کا ایک تار میرے سر اور پاؤں سے سنساتا ہوا نکل گیا ہے!

www.iqbalkalmati.blogspot.com

میں نے باہر آکر آواز دی۔ "محمد نواز۔"

کوئی اس طرف آرہا تھا مگر مجھے جواب نہ ملا۔

"بھیا نواز۔" شیدو اپنی باریک آواز کو کوئل کی طرح پوری قوت سے بلند کرتے ہوئی پکاری مگر اسے بھی جواب نہ ملا!

"وہ ہمیں حیران کرنا چاہتا ہے۔" بڑھیا مسکراتی ہوئی بولی۔

اب وہ ہم سے پانچ قدم کے فاصلے پر تھا۔ بڑھیا کانپ رہی تھی۔ شیدو کانپ رہی تھی! ـــــ چار قدم ـــــ تین قدم!

"نواز۔" دونوں یک زبان ہو کر اسے گلے لگانے کے لیے دو قدم آگے بڑھتی ہوئی پکاریں۔

"میں نواز نہیں ہوں۔"

"ہائیں!"

"اوئی" شیدو نے اسے چھو لیا تھا!

"تو پھر تم کون ہوں؟" بڑھیا جیسے اسے دبوچ لے گی۔

"میں پولیس کا سپاہی ہوں۔"

ہم تینوں کے دل دھک سے رک گئے اور پھر یوں دھڑکے جیسے ابھی پھٹ کر بکھر جائیں گے!

"میں تھانے میں سپاہی ہوں' نواز میرا بچپن کا دوست ہے۔ وہ کشتی سے اترا اور ادھر آنے لگا کہ تھانیدار نے چار سپاہیوں کو حکم دیا کہ اسے پکڑ لائیں' کیونکہ افسر مال صاحب کا اسباب بنگلہ پر پہنچانا ہے اور اس وقت بیگار پر اور کوئی آدمی نہ پکڑا جا سکا اس نے مجھے کہا تھا کہ میرے گھر اطلاع دے دینا۔"

"لیکن وہ کب آئے گا؟" بڑھیا جیسے گر جائے گی۔

"ایک ہفتے تک بنگلے پر اس کو افسر مال صاحب کے دفتر کا پنکھا بھی کھینچنا ہے!"

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بڑھیا دیوار سے لگ گئی اور پھر ہولے ہولے نیچے کھسکتی زمین پر بیٹھ گئی اور شیدو کا چہرہ!——جیسے چھوئی موئی کسی کے مس سے مرجھا کر بے رونق ہو جاتی ہے!

اداس سپاہی کچھ دیر تک بڑھیا کو دیکھتا رہا اور پھر ہولے ہولے قدم اٹھاتا کھیتوں کے درے غائب ہو گیا۔

میں نے اب وہاں ٹھہرنا مناسب نہ سمجھا۔ اندر سے تھیلا اٹھایا۔ باہر آیا۔ شیدو کی آنکھوں سے دو آنسو ڈھلک کر اس کے رخساروں پر افق کے قریب ڈوبتے ہوئے تاروں کی طرح چمک رہے تھے! اور بڑھیا اپنا نچلا ہونٹ اپنے پوپلے منہ میں ڈالے جانے کیا سوچ رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر بولی۔

"جاتے ہو بیٹا؟"

"ہاں ماں۔"

"اچھا خوش رہو!"

* * *

www.iqbalkalmati.blogspot.com

سپنوں کا محل

ادراک اور شعور کی پرلی طرف میں نے سپنوں کا ایک محل بنایا ہے جو عنبر اور لوبان کی خوشبوؤں سے لبریز اور کافوری فانوسوں کی سیمیں روشنیوں سے منور ہے۔ یہاں میں نے اپنی امیدوں کی رانی کو ایک زمردیں سنگھاسن پر بٹھا رکھا ہے۔ میں گیت گاتا ہوں۔ وہ طاؤس بجاتی ہے اور پریاں ہمارے سروں پر آکر منڈلاتی ہیں اور اپنے پروں کو اس طرح پھڑپھڑاتی ہیں جیسے خاموش خوابگاہوں کے ریشمی پردے سرسراتے ہیں۔ میری اس شہزادی کا نام خدا جانے کیا ہے۔ لیکن میں اسے شہزادی ہی کہہ کر پکارتا ہوں کیونکہ اس کے انداز میں شاہانہ وقار اور امیرانہ طنطنہ ہے!

واللہ میں شاعری نہیں کر رہا۔ آپ شاید میرے جذبات و احساسات میں دلچسپی محسوس نہ کریں۔ کیونکہ یہ بھاپ اور فولاد کا زمانہ ہے' سائنس کے مادی نظریات کا دور ہے۔ یہ "کیوں" اور "کیسے؟" اور "کب" اور "کہاں" کا وقت ہے اور میں باتیں کر رہا ہوں خوابوں کی دنیا کی!

یہ جو گاؤں سامنے نظر آرہا ہے نا' یہیں میں نے اسے پہلی مرتبہ دیکھا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اپلے تھوپ رہی تھی گلی کے کنارے۔ میں ایک گھوڑے پر سوار تھا۔ راستہ نہ پا کر میں نے کہا۔ "لڑکی ذرا ادھر ہو جا' تاکہ گھوڑا گزر جائے۔"

"ذرا دیوار سے لگ کر نکل جا۔" وہ اپنے خوابگوں پلکیں اٹھا کر بولی اور میں دیوار سے لگ کر نکل گیا۔ پاؤں چھل گیا دیوار سے رگڑ کھا کر۔ لیکن اس کی آنکھوں کی تحکمانہ چمک نے مجھ کسی گلے شکوے کی مہلت نہ دی۔ محکمہ انہار کے فولادی دِل رکھنے والے ضلعدار پر اپلے تھوپنے والی نے ایک ایسا بے پناہ تیر پھینکا کہ فولاد موم کی طرح گداز ہو گیا اور نبضیں پھڑکنا اور آنکھیں جھپکنا بھول گئیں!

جب میں ذیلدار سے مل کر پلٹا تو وہ چھت پر کھڑی منڈیر پر گیلے کپڑے پھیلا رہی تھی۔

میں نے کہا۔ "لڑکی ہو سکے تو ٹھنڈے پانی کا ایک پیالہ لادے۔ پیاسا ہوں اور سفر کیا ہے۔ راستے میں کوئی ندی نہیں پڑتی اور دھوپ بھی تیز ہے!"

بولی۔ "چھاچھ پی لو گے کیا؟"

میں نے کہا۔ "اگر خود تو نے ہی دودھ بلویا ہو تو چھاچھ ہی پلا دے!"

"کیا مطلب؟" اس نے اوڑھنی کا پھڑ پھڑاتا ہوا پلو سینے پر پھیلا دیا اور چتون پر بل لا کر مجھے شاہانہ انداز سے گھورنے لگی۔ میں نے گھبرا کر کہا۔ "میرا مطلب یہ ہے کہ میں وہی چھاچھ پیوں گا جو خود تو نے تیار کی ہو گی۔ آخر تم لوگوں کے ہاں غلیظ نائنیں اور دھوبنیں بھی کام کرتی ہیں نا!"

"نہیں بھئی!" وہ بولی۔ "میں خود بلوتی ہوں۔ ہم اتنے بڑے زمیندار نہیں!"

اچھا! تو غریب گھرانے کی ہے یہ لڑکی! میری سرمایہ دارانہ رگ پھڑکی۔ اور جب وہ چھاچھ لے کر آئی تو بولی۔ "تو کہاں جائے گا؟"

"لائل پور۔" میں نے کہا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"بہت بڑا شہر ہے؟" اس نے پوچھا۔

اور میں نے جواب دیا۔ "ہاں' بہت بڑا شہر ہے۔ تمہارے گاؤں سے دس بیس گنا بڑا۔ وہاں یہ چھاچھ واچھ نہیں پیتے ہم لوگ۔ وہاں تو انگریزی شربت ہوتے ہیں۔"

"شکر کے شربت؟"

"نہیں انگوروں کا رس!"

"اچھا!" اس نے بھویں سکیڑ کر کہا اور پیالہ لے کر اندر چلی گئی۔

اب آپ اندازہ لگالیں کہ اس گاؤں میں میرا دورہ کتنے روز ہوتا ہو گا۔ مہینے میں پندرہ دن۔ پندرہ دنوں میں اگر ایک شخص للچائی ہوئی نظروں سے ایک لڑکی کو مسلسل دیکھے تو دونوں دلوں کے تار جھنجھنا اٹھتے ہیں۔ سو میرے دل کے خفیہ تار بھی جھنجھنائے۔ ادھر سے بھی میں نے خوابگوں پلکوں کی جھپک میں یہ جھنجھناہٹ سنی۔ میری کنپٹیوں کے قریب جل ترنگ سے بجنے لگے۔ ادھر اس نے چھت کی منڈیر کے پاس میری تاک میں بیٹھنا شروع کر دیا۔ میں گلی میں سے گزرتا تو کتاک سے ایک کنکر میرے لمبے کلاہ پر!——— "ارے کون؟" میں تجاہل عارفانہ سے پوچھتا اور وہ گلی میں ادھر ادھر جھانک کر بڑی بڑی آنکھیں پھیلا کر کہتی "بھتنی!"——— اور فضا میں ہزاروں پریاں پر پھڑپھڑانے لگتیں۔

میں ذیلدار کی چوپال میں رات کو سوتا تھا اور جب سب غافل ہو جاتے تو میں وہاں سے کھسک آتا۔ گاؤں کے کتے ہر راہ چلتے کو دیکھ کر بھونکنے میں شہری کتوں سے زیادہ دریا دل واقع ہوئے ہیں اس لیے میری دونوں جیبیں بڑے بڑے پھلکوں سے بھری ہوتیں۔ گرمیوں کا موسم تھا۔ وہ اپنے بوڑھے والدین کے ہمراہ چھت پر سویا کرتی تھی۔ میں دیوار کے ساتھ لگ کر نہایت مدھم آواز میں کھنکارتا اور کہتا۔ "بھتنی" اور منڈیر پر سے اس کا سربلند ہوتا۔ بال بکھرے ہوئے۔ چولے کے بٹن کھلے ہوئے۔ اپنا سڈول بازو نیچے لٹکا کر

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کہتی۔ "اررررے ابا ابھی خراٹے نہیں بھر رہے اور ماں ابھی مچھروں کی وجہ سے ٹخنے کھجلا رہی ہے۔ پرلی گلی میں نکل جا!"

اور میں کہتا۔ "اری اُدھر تو بڑا خوفناک کتا ہے کسی کا۔ کمبخت کُلچے بھی قبول نہیں کرتا۔"

اور وہ مڑ کر چھت پر نگاہیں دوڑاتی اور پھر پلٹ کر کہتی۔ "میں آئی!"

—— اور پھر ہم دونوں گلیوں میں چھپتے چھپاتے باہر کھیتوں میں چلے جاتے۔ مینڈھوں پر شبنم آلود گھاس سے جب ہمارے پاؤں مس ہوتے' گنجان کھیت سر سراتے' ٹڈے چیں چیں کرتے' رات سنسناتی' اور جب دور جیسے ستاروں کے قریب سے ٹیٹری کی درد بھری الاپیں سنائی دیتیں تو ہمارے دلوں میں گھنگھروؤں کی جھنکار سی بلند ہوتی۔ ہماری انگلیاں اسقدر ٹھنڈی ہو جاتیں جیسے ہم کرۂ زمہریر میں محوِ پرواز ہیں اور ہمارے کنپٹیاں یوں تپنے لگتیں جیسے دھوپ میں ریت! ہم وہیں شبنم آلود گھاس پر بیٹھ جاتے یا صحیح الفاظ میں گر جاتے۔ وہ میری قمیض کے بٹنوں کو گھماتی اور پھر انہیں توڑ کر گنجان کھیتوں میں پھینک دیتی —— ایک سیمیں قہقہے کے ساتھ!

میں کہتا۔ "اری اگر میں تیرے چولے کے بٹن اسی طرح توڑ کر پھینک دوں تو پڑی چیخے گی!"

اور یہ سن کر اس کا جسم ڈھیلا سا پڑ جاتا جیسے ریشم کی گٹھڑی کی گرہیں آپ ہی آپ کھل جاتی ہیں۔ اس کی زبان گنگ ہو جاتی جیسی ہسپتال کی کوئی الھڑ نرس شب بیداری سے تھک کر بیٹھ گئی ہے۔ میں اسے جھنجھوڑتا اور وہ پرے کھسک کر کہتی۔

"ارے تو ایسی باتیں نہ کیا کر! میرا دم گھٹنے لگتا ہے۔"

"دم گھٹنے لگتا ہے تیرا؟" میں اسے چھیڑتا اور وہ ہولے ہولے بڑبڑاتی کھیت کے پرلے سرے پر جا کر بیٹھ جاتی اور پھر ہماری گفتگو بہت سے پلٹے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کھاتی۔ گندم کا نرخ گندمی رنگ۔ گاؤں کے متعفن گھورے۔ لاہور کا لارنس۔ دلی کا چاندنی چوک اور پھر ——— "ابا جاگ پڑے تو سمجھو کل میری چوٹی کٹ گئی۔"

میں کہتا۔ "میں لاہور سے تمہیں مصنوعی بال لا دوں گا۔ ابریشمی بال' چاند کی کرنیں۔"

وہ کہتی۔ "دودھ کو بہت زیادہ بلویا جائے تو مکھن پگھل جاتا ہے اور چھاچھ بے مزہ ہو جاتی ہے لیکن تم کیا سمجھو چھاچھ واچھ کی باتیں؟ تم تو پینے کی چیزوں کے عجیب عجیب سے نام لیتے ہوں۔ سناؤ تو دو ایک نام؟"

اور میں کہتا۔ "اورنج سکوئیش' جانی واکر' ایکشا نمبرون۔"

"بڑے مزیدار ہوں گے یہ شربت؟" وہ پوچھتی۔

اور میں کہتا۔ "ہاں کبھی پلاؤں گا تمہیں۔"

"کب؟" وہ پوچھتی۔

اور یہ سوال سن کر میرے دل و دماغ پر سنگین تاریکیاں پھیل جاتیں۔ احساسات کا ایک دھارا یک لخت تذبذب کے ریگزار میں غائب ہو جاتا۔ زبان ڈھیلا بن جاتی۔ میں اسے اس "کب" کا جواب دنیا چاہتا مگر نہ دے سکتا۔ مجھ میں جرأت نہیں تھی۔ میں بزدل تھا۔ میں جانتا تھا۔ کہ اگر میرا جواب اسے برا لگا تو پھر وہ اپنے فطری شاہانہ ٹھٹنے کو بروئے کار لا کر مجھے ٹھکرا کر گاؤں کو چل دے گی اور مجھ سے یہ راتیں بھی چھن جائیں گی۔ وہ میرے پسلیوں میں ٹھوکا دے کر کہتی۔ "ارے کب؟"

اور میں کہتا۔ "جب اللہ نے چاہا۔"

ہنسی کو ضبط کر کے وہ چٹکی بجاتی اور زبان اور تالو کی مدد سے پٹاخہ سا چلا کر کہتی۔ "ارے تُو تو بدھو ہے!"

بدھو! ——— یعنی بزدل اور کم ظرف اور ریا کار اور جھوٹا اور فریبی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اور لالچی اور ــــــ اور ــــــ اور مجھے ہر طرف طاعون زدہ چوہوں کا تعفن سا محسوس ہونے لگتا!

اور جب میں چوپال پر واپس آتا تو دل میں جیسے بھڑیں ڈنک پر ڈنک لگائے جا رہی ہیں۔ کانوں کے قریب بھنبھنا رہی ہیں۔ قمیض میں گھس کر رینگتی پھر رہی ہیں۔ اے ہے!۔ میں چادر کو لاتوں کی چرخی چلا کر پرے پٹخ دیتا۔ تکیہ مروڑ کر پھینک دیتا اور پھر اچانک اپنے پٹھوں کو اکڑا کر کہتا۔ "ارے ہمت کر۔ ہمت کر کمبخت! عورت کے انداز میں چاہے کتنا ہی وقار کیوں نہ ہو' آخر وہ عورت ہے یعنی مجسم کمزوری' مرد کی غلام' عورت آخر عورت ہی ہے نا!" اور پھر مجھے ہیر یاد آجاتی ــــــ کہ کیسے وہ رانجھے کے عشق میں پریشان رہی اور سسی' کہ کیسے وہ گھربار چھوڑ کر تھل کے ویرانوں میں جا بسی اور سوہنی ــــــ اور شیریں ــــــ اور لیلےٰ ــــــ اور ــــــ اور کلوپیٹرا! یہاں پہنچ کر میرے دماغ میں نشتر سے تیر جاتے۔" کلوپیٹرا تو ملکہ تھی ــــــ شہزادی! ــــــ بڑا وقار تھا اس میں ــــــ وہ انطونی سے عشق نہیں کرتی تھی ــــــ! ــــــ لیکن آخر وہ بھی عورت ہی تھی نا؟ ــــــ اور پھر سانپ کی مدد سے اس نے اپنی نسوانی کمزوریوں کا مظاہرہ بھی کر دیا تھا۔

بہت رات گئے تک میں یہی سوچتا رہتا اور جب لائل پور واپس آتا تو میری رگ و پے میں نئی زندگی سی حلول کر جاتی اور میں مصمم ارادہ کر لیتا کہ اب کے تو اسے اس کمبخت "کب" کا جواب دے ڈالوں گا۔ اگر اس نے برا نہ مانا تو جائے گی کہاں۔ اٹھوا لوں گا اسے!

اور ایک بار جب میں لائل پور سے چلا تو یوں محسوس کر رہا تھا جیسے میں نپولین ہوں اور روس پر یلغار کرنے جا رہا ہوں۔ نصف شب کو میں چوپال پر سے اٹھا تو اس کے گھر کی دیوار سے لگ کر بولا۔ "ہے بھتنی!؟"

منڈیر پر سے جھک کر وہ بولی۔ "ارے آ گئے تم؟ ــــــ میں تو تمہیں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

دیکھ رہی تھی اور جب ہم باہر کھیتوں میں شبنم آلود گھاس پر جاکر گر پڑے تو باتوں کے دوران میں اسے چھاچھ اور جانی واکر کے موضوع کی طرف کھینچ لایا۔

"کبھی پلاؤں گا تمہیں۔" میں نے کہا۔

"کب؟" اس نے پوچھا۔

——اور کائنات قلابازی کھا گئی۔ ستارے ایک دوسرے سے ٹکرا ٹکرا کر بجنے لگے۔ کھیت اوپر اٹھ کر فضاؤں میں معلق ہو گئے۔ دل و دماغ کی طنابیں کھنچ گئیں۔ میرا دل ایک سیکنڈ میں سو بار دھڑک گیا ہو گا۔ میں نے کانپتے ہوئے اپنی جیب سے روپوں سے بھرا ہوا بٹوا باہر نکالا اور اس کی انگلیوں میں تھما کر بولا۔ "تمہیں اب کے ہمیشہ کے لیے ساتھ لے جاؤں گا نا! بس تم ہو گی اور لائل پور کے کھلے بازار!"

اور بٹوے میں سکوں کا چھناکا سن کو وہ ایک لمحے کے لیے مجسمہ کی طرح جم کر رہ گئی۔ اور پھر اچانک بٹوا دور کھیتوں میں پھینکتے ہوئے بولی۔ "ارے سوداگر کہیں کے' تو مجھے خریدنے آیا ہے۔ ارے بدھو۔ کیا تو نے مجھے ربڑ کی گڑیا سمجھ لیا ہے کہ دو کوڑی دے کر مول لے لے گا۔ بدمعاش کہیں کا۔ لُچّا۔ شہدا!"

اور وہ اونچی نیچی مینڈھ پر ناگن کی طرح تیرتی اندھیرے میں گھل گئی!

نپولین کی روس پر یلغار اور پھر اس کی پسپائی——میں نے اپنے بال نوچ لیے۔ جی چاہا۔ بڑھ کر اسے اٹھالوں اور کاندھوں پر ڈال کر سامنے جنگل میں لے جاؤں اور اسے اس قدر پیٹوں کہ اس کے——اس کے چولے کے بٹن ٹوٹ کر الگ جا گریں——لیکن میرے ہاتھ پیر شل ہو چکے تھے۔ میرا جسم سو گیا تھا۔

دوسرے روز صبح سویرے میں گھوڑے پر سوار ہو کر لائل پور کو

www.iqbalkalmati.blogspot.com

روانہ ہوا۔ جب اس کی گلی میں سے گزرا تو ہلکے ہلکے دودھ بلوئے جانے کی آواز کے ساتھ مجھے ایک گیت سنائی دیا۔

دھیرے دھیرے بلوری سہیلی

مکھن پگھلا جائے

میں اس کے بعد اس گاؤں میں دورے پر کبھی نہیں گیا۔ یہیں سے کھیت ویت دیکھ لیتا ہوں۔ مجھے وحشت سی ہوتی ہے وہ گلیاں دیکھ کر۔ اور اسی لیے ادراک اور شعور کی پرلی طرف میں نے سپنوں کا ایک محل بنایا ہے۔ جو عنبر اور لوبان کی ـــــــ ہائیں! آپ تو مسکرا رہے ہیں!

* * *

www.iqbalkalmati.blogspot.com

مانو کی میاؤں

دادا جان کے انتقال کے بعد بہت دنوں تک ہم سب پر مردنی سی چھائی رہی اور درودیوار پر افسردگی سی برستی رہی۔ ان کی محبوب بلی "مانو" نے بھی ان کے رخصت ہوتے ہی چپ سادھ لی تھی۔ لیکن جب کبھی سوتے میں یا بھولے سے وہ نحیف مریل آواز میں "میاؤں" کا بھولا بسرا گیت گنگناتی تو دادی اماں اپنی بے ربط چیخوں سے گھر بھر کو سر پر اٹھا لیتیں۔ اور اتنی دیر تک روتی رہتیں کہ مجبوراً ہمیں بھی ان کے ساتھ شامل ہونا پڑتا۔ دراصل مجھے دادا جان کے انتقال پر نہ افسوس ہوا تھا اور نہ خوشی ——— میں نے تو اسے بس ایک معمولی واقعہ جانا جیسے نرگس کے ہاتھوں کانچ کا پیالہ چھوٹ کر سنگین فرش پر کرچی کرچی ہو گیا یا دادی اماں کا پاؤں مانو کی دم پر پڑ گیا اور مانوں کی چیخوں سے سب کے دل دھڑکنے لگے۔ نوے سال بے فکریوں میں گزار کر وہ دو دن بیمار پڑے اور تیسرے دن چل دیئے۔ نہ بیماری کوئی اتنی تکلیف دہ تھی۔ نہ سکرات کا عرصہ اتنا طویل تھا۔ دو چار ہچکیوں سے دادا جان کے ڈھیلے ڈھالے پنجرے سے روح کھسک کر کہیں اڑ گئیں۔ ملا جی کو قرآن مجید پڑھنے کے لیے بھی تو

www.iqbalkalmati.blogspot.com

نہ بلوایا جا سکا۔ ادھر دادا جان کی آنکھیں بند ہوتے ہی دادی اماں پکار پکار کر رونے لگیں۔ "ہے میرے آقا! تو نے دنیا کو جی بھر کر بھی نہ دیکھا۔ یہ بھی کوئی عمر ہے میرے مالک!" پڑوسنیں یہ سن کر بھونچکا سی رہ گئیں۔ میں اور آپا جان بھی اس مضحکہ خیز اظہار افسوس پر حیران تھیں۔ ہمیں جگ ہنسائی کا خوف تھا۔

آخر جس شخص کے مسوڑھے پچھلے دس بارہ سالوں سے دانتوں کا کام دے رہے ہوں، جس کی آنکھیں چہرے کی دوسری گہری اور تاریک جھریوں میں گھل مل گئی ہوں اور جس کے کانوں کی لویں لٹک کر اس کے کاندھوں کو چھو رہی ہوں، جو ایک قدم بھی اٹھائے تو سانس اکھڑ جائے، جس کا کام سوائے ماٹوں کو اپنی گود میں بٹھا کر ہاتھ پھیرنے کے اور کچھ نہ ہو، وہ اس دنیا سے اگلی دنیا منتقل ہو جائے تو افسوس کا ہے کا! ہر شخص اگر دو دو تین تین سو سال تک جئے جائے تو یہ دنیا بہت جلدی بوڑھی کھوسٹ ہو کر رہ جائے۔ انہیں خیالات کی وجہ سے مجھے بہت کم آنسو آتے تھے۔ اور اکثر مجھے دادی اماں کی تیز نگاہوں سے بچنے کے لیے منہ پھیر کر آنکھوں پر تھوک لگانا پڑتا تھا۔ اگر کسی وقت بغیر کسی کوشش کے کوئی آنسو نکل آتا تو میں اس وقت اتنی خوش ہوتی کہ جتنی دادی اماں، دادا جان کے دوبارہ زندہ ہو جانے کے خیال سے۔

دس بارہ دنوں کے بعد ہمیں کانپور سے ایک چٹھی ملی۔ مرحوم ابا جان کے نہایت عزیز دوست مرزا عباس بیگ معہ اپنے اہل و عیال کے، تعزیت کی خاطر تشریف لا رہے تھے۔ استقبال کی تیاریاں تو کیا ہوتیں۔ آخر ماتم کا موقع تھا۔ لیکن دادی اماں کے رویہ میں کچھ تبدیلی ضرور رونما ہو گئی۔ وہ بیٹھے بیٹھے یوں اچانک کھڑی ہو جاتیں اور اس تندہی سے برتنوں کو ترتیب دیتیں، بستر جھاڑتیں اور فرنیچر سنوارتیں جیسے عنقریب کوئی بارات آنے والی ہے۔

جمعہ کے روز مرزا عباس بیگ کو کراچی میل پر تشریف لانا تھا۔ بھائی رشید اور قادر ملازم سٹیشن پر چلے گئے۔ ہم سب نے مرزا صاحب کا نام تو سن

www.iqbalkalmati.blogspot.com

رکھا تھا اور یہ بھی جانتے تھے کہ ابا مرحوم سے ان کے تعلقات بہت گہرے تھے۔ لیکن جب سے ابا نے وفات پائی تھی۔ مرزا صاحب کا نام ہمارے گھر میں بہت کم لیا جانے لگا تھا۔ دادا جان کی وفات نے ان کی یاد تازہ کر دی تھی اور ہم سب ان کی بیوی اور بیٹی کو دیکھنے کے منتظر بیٹھے تھے۔ کوئی آدھ گھنٹہ کے بعد موٹر ہمارے مکان کے بڑے پھاٹک پر آکر رکی۔ ادھر موٹر کے رکنے کی آواز آئی، ادھر دادی اماں چیخ کر فرش پر ڈھیر ہو گئیں اور چلانے لگیں "ہائے میرے آقا تم مجھ نا ہنجار کو چھوڑ کر کدھر چل دیئے؟ ساری عمر تم نے میری ناز برداریاں کیں، تم کما کر لاتے رہے اور میں ابھاگن تمہاری کمائی دھول کی طرح اڑاتی رہی۔ اب جبکہ ہماری منزل بہت قریب آچکی تھی، تم میرا ساتھ چھوڑ کر کدھر چلتے بنے؟ آج تمہارے مرحوم بیٹے کے پیارے دوست مرزا صاحب تمہیں ملنے آئے ہیں۔ مگر تم منوں خاک تلے پڑے میری فریادیں بھی سن رہے ہو کہ نہیں"

دادی اماں روئے جاتی تھیں اور پکارے جاتی تھیں۔ مرزا عباس بیگ معہ اپنی بیوی اور بیٹی کے برآمدے کے ستونوں کا سہارا لیے رو رہے تھے اور ان کا نوجوان بیٹا ایک طرف کھڑا رومال منہ پر رکھے فرش کو ٹکٹکی باندھے گھور رہا تھا۔ آپا اور میں نے بھی رونے کی کوشش کی۔ دو چار ہچکیاں بھی لیں۔ آنکھیں زور زور سے بھینچیں کہ کوئی بھولا بھٹکا قطرہ ڈھلک کر رخسار پر چمکنے لگے۔ آنکھیں یوں خشک معلوم ہوتی تھیں جیسے ان میں خاک جھونک دی گئی ہے۔ کچھ دیر بعد آپا جان نے تو بصد مشکل اپنی داہنی آنکھ سے ایک آنسو نکال ہی لیا۔ اب میری حالت ناگفتہ بہ تھی۔ میں نے دوپٹہ سنبھالنے کے بہانے سے گھونگھٹ نکال کر جلدی سے آنکھوں پر تھوک لگا لیا اور دو چار ہچکیاں اس زور سے لیں کہ رومال والے صاحب بھی چونک کر مجھے گھورنے لگے۔ دادی اماں نے مجھے ایسی نظروں سے دیکھا گویا میں نے انہیں اپنی دو چار بے ہنگم ہچکیوں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

سے مول لے لیا ہے۔ مرزا عباس بیگ اور ان کی بیوی کی آنکھیں بھی کہہ رہی تھیں۔ "ہائے انوری! تیرے دادا جان چل بسے!" صرف آپا جان زیر لب مسکرا رہی تھی۔ گویہ مسکراہٹ صرف میں نے ہی محسوس کی۔

کوئی پندرہ منٹ کے بعد دادی اماں اٹھیں' مرزا صاحب کے سر پر ہاتھ پھیرا' ان کے بیٹے کے سر پر ہاتھ پھیرا جو شرم سے سمٹ سمٹ گیا۔ انہوں نے پوچھا۔ "کیا نام ہے تمہارا؟" اس نے کہا "انور"—— میرے دل کو جیسے کسی نے چکی کے دو پاٹوں میں دبالیا۔ آپا بھی کچھ پریشان سی ہوگئیں۔ دادی اماں نے مرزا صاحب کی بیٹی کے دوپٹے پر ہاتھ پھیرتے ہوئی کہا۔ "اور تمہارا بیٹی؟" اس نے نگاہیں نیچی کیے نہایت دھیمی آواز میں جواب دیا۔ "رشیدہ" میرا بھائی رشید جو مرزا صاحب کے پاس ہی کھڑا تھا' یوں کانپ اٹھا جیسے صاف نیلے آسمان سے اس کی ناک پر ایک بوند آگری ہے۔

ہم سب بڑے کمرے میں آگئے۔ مرزا صاحب ایک پلنگ پر بیٹھ گئے۔ دادی اماں مرزا صاحب کی بیوی' آپا جان' رشیدہ اور میں فرش پر بیٹھ گئیں اور رشیدہ اور انور سامنے دو کرسیوں پر۔ مرزا صاحب نے دادا جان کی صفات کا تذکرہ چھیڑ دیا۔ "ایک روز بازار سے گزر رہے تھے کہ ایک مہتر کے بچے کو بند دوکان کے تختے پر پورے زور سے چیخیں مارتے ہوئے دیکھا۔ ان سے نہ رہا جان سکا۔ ایک دوکان سے دونی کی مٹھائی خریدی اور کوڑا کرکٹ سے اٹے ہوئی بچے کے سر پر ہاتھ پھیر کر اس کے آگے دھردی اور مجھے فرمانے لگے۔ "میرزا بیٹا! خدا کو اپنی ساری مخلوق پیاری ہے صرف ہم بندوں نے چھوٹے بڑے اور امیر غریب کے امتیازات گھڑ لیے ہیں۔" میں بے اختیار ان کے اس زریں ارشاد پر آفرین پکار اٹھا۔"

دادی اماں کی ننھی ننھی دھندلی آنکھوں میں بے شمار آنسو کانپ رہے تھے۔ اور کئی ان کے جھریوں میں جذب ہو گئے تھے۔ مرزا صاحب کی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

داڑھی تو آنسوؤں سے بھیگ گئی تھی۔ فرما رہے تھے۔ "پھر بھیا اکرم علی چل بسے۔ میں نے ان کے ساتھ جو گھڑیاں کاٹیں انہیں کم از کم میں خود تو اپنی زندگی میں شمار نہیں کرتا۔ وہ کوئی الگ زندگی تھی۔ ان کا چالیس سال کی عمر میں انتقال کر جانا!—— واللہ اس حادثے نے میرے حواس آج تک معطل کر رکھے تھے۔ چالیس سال آخر کیا عمر ہے! اب بھی جب کبھی انور کا ننھا بھائی کہتا ہے۔" ابا جی! وہ سامنے کس کی تصویر لٹک رہی ہے؟ وہ مجھے دیکھ کر مسکرا رہی ہے۔ کیا یہ چوکھٹے سے اترنا چاہتی ہے؟" تو خالہ جان! خدا کی قسم' میں اس بچے کی طرح رونے لگتا ہوں جس کا نیا نیا کھلونا ابھی ابھی کسی نے پاؤں تلے مسل ڈالا ہو۔ میں نے تو......."

مرزا صاحب رک گئے۔ سارا کمرہ ششدر رہ گیا۔ دادی اماں نے اچانک بیٹھے بیٹھے چیخنا شروع کر دیا۔ میں اور آپا جان ان کی طرف دوڑیں۔ ہاتھ اور پاؤں ملے۔ دھیمی اور جھجکی آواز میں تسلیاں دیں۔ مرزا صاحب بھی پلنگ سے نیچے اتر آئے اور گھبرائی ہوئی آواز میں دادی اماں کو سمجھانے لگے۔ آخر خدا خدا کر کے ان کی چیخیں رکیں اور ہچکیوں کی باری آئی۔ ہچکیاں ختم ہوئیں پر آنسو بہے جا رہے تھے۔ خدا جانے ان کی خشک کھوپڑی میں اتنا عرق کہاں سے آگیا تھا کہ ان کی چادر بالکل بھیگ گئی تھی۔ ہم سب اپنی اپنی جگہوں پر جانے کے لیے اٹھنے ہی والے تھے کہ انھوں نے اپنی گود سے "مانو" نکالی اور سامنے دھر کر پھر روتے ہوئے کہنے لگیں۔ "میرزا بیٹا! یہ ان کی نشانی ہے۔ اسے انہوں نے اپنے ہاتھوں سے پالا پوسا' ہر وقت ان کی گود میں رہتی تھی۔ خود کھلاتے تھے۔ خود پلاتے تھے۔ اب جب میں اسے کمروں میں پریشان پھرتے دیکھتی ہوں اور پھر جب یہ اپنی تلاش میں ناکام ہو کر میرے پاس آتی ہے اور دردناک آواز میں "میاؤں" کرتی ہے تو مجھ ابھاگن کا کلیجہ پھٹنے لگتا ہے!"

دادی اماں یہاں تک پہنچی تھی کہ بلی نے دم کھڑی کر کے دادی اماں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کی طرف دیکھا اور ایک لمبی دردناک میاؤں کرتی ہوئی پھر ان کی گود میں گھس گئی۔ دادی اماں کو پھر وہی دورہ پڑ گیا۔ سب مغموم ہو گئے۔ میں نے انور کی طرف دیکھا۔ وہ اپنی مسکراہٹ چھپانے کے لیے جیب سے رومال نکال رہا تھا۔ مجھے اپنی طرف متوجہ دیکھا تو جھینپ گیا اور رونی صورت بنانے کی کوشش میں سر جھکا لیا۔

شام کے کھانے سے پہلے میں نے موقع پا کر مانوں کو گودام میں بند کر دیا کیونکہ اس کی موجودگی میں کسی نہ کسی وقت دادی اماں کے اشکبار ہونے کا اندیشہ تھا۔ یوں دادی اماں شوق سے اس مشغلے سے اپنا دل بہلا سکتی تھیں لیکن قہر تو یہ تھا کہ ہم سب کو ان کی چیخوں میں حصہ لینا پڑتا تھا۔ مہمانوں کے سامنے مصنوعی چیخیں جس ندامت اور خجالت کا باعث ہوتی ہیں' اس کے تصور ہی سے دل و دماغ میں چبھن سی سرسرانے لگتی ہے۔

کھانا کھا کر دادی اماں نے ادھر ادھر دیکھا اور کہنے لگیں۔ "انوری بیٹا! مانو کدھر گئی۔ گھنٹہ بھر سے نظر نہیں آئی۔ اسے گھونٹ بھر دودھ پلا دیتیں۔"

میں نے کہا "کسی کونے میں پڑ رہی ہو گی۔ دادا جان کے بعد تو اسے کھانے پینے کی سدھ بدھ ہی نہیں رہی۔"

مرزا صاحب کی بیوی ناک پر ہاتھ رکھ کر بولی۔ "حیوان میں بھی کتنی سمجھ ہوتی ہے۔"

میں نے مسکرا کر آپا کی طرف دیکھا جو دور برآمدے کے ستونوں پر نظریں گاڑے بیٹھی تھیں۔ انہیں انتظار تھا کہ ابھی مانو اپنا مربع شکل کا سر نکال کر میاؤں پکارے گی اور دادی اماں کے آنسوؤں کے ذخیرے کا ڈاٹ بھک سے اڑ جائے گا۔ میں نے انہیں دھیرے سے ٹھوکا لگا کر کہا۔ "مانو گودام میں بند ہے!"

انور ہمارے قریب بیٹھا تھا۔ میری سرگوشی سن لی۔ میں نے اس کی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

طرف دیکھا، وہ ناخن سے ایک پلیٹ کرید رہا تھا اور زیر لب مسکرا بھی رہا تھا .... اچانک وہ اپنی پتلیوں کو کھینچ کر آنکھوں کے آخر گوشوں تک لے آیا اور مجھے کچھ اس انداز سے دیکھا کہ میں گھبرا کر اپنی جگہ سے اٹھ بیٹھی۔

"کہاں جا رہی ہو؟" دادی اماں نے پوچھا۔

"کہیں نہیں؟" میں نے بیٹھتے ہوئے کہا۔

"تو پھر اٹھی کیوں تھی؟"

میں خاموش رہی۔

قادر پانی پلانے آیا تو دادی اماں نے پوچھا۔ "بستر لگا دیئے؟ انور کا بستر کہاں لگایا؟ رشید کے ہاں؟ بس ٹھیک ہے!"

مرزا صاحب بولے۔ "لیکن انور کی ایک عجیب عادت ہے۔ سونے سے پہلے ایک آدھ گھنٹہ پڑھتا ضرور ہے ورنہ ساری رات کروٹیں لیتے گزر جاتی ہے۔ رشید تمہارے ہاں کوئی ادبی رسالہ ہو گا؟ اسے دے دینا کہ وقت کاٹ سکے۔"

رشید بھائی سائنس کے طالب علم تھے۔ انہیں ادب سے کیا لگاؤ! آپا جان الگ مادہ پرست تھیں اور میرے ٹوٹے پھوٹے اشعار کو روحانی عیاشی کہہ کر پکارتی تھیں۔ میرے ہاں ہندوستان کے سب اچھے پرچے آتے تھے۔ دادی اماں نے جھٹ میری طرف دیکھا اور بولیں۔ "انوری! وہ جو ہر مہینے تمہارے پاس نئی نئی کتابیں آتی ہیں وہی لا دے نا بھیا کو۔ جا بھاگ کر جا!"

میں اپنے کمرے میں جا کر رسائل کی چند فائلیں اٹھا لائی اور انور کے آگے دھر دیں۔

انور نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ "خود بھی کچھ لکھتی ہو انوری بہن؟"

میں بولی۔ "نہیں۔ میں اس مرض میں مبتلا نہیں۔"

"مرض؟"

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"ہاں۔ شعر کہنا' افسانہ لکھنا' یہ بھی ایک قسم کا دماغی تپ دق ہے۔"

انور متعجب ہو کر بولا۔ "لیکن آخر یہ پرچے کیوں منگاتی ہو تم؟"

"جی بہلاوے کے لیے! بیماروں کی پریشان خیالیوں سے محظوظ ہونے کے لیے۔"

انور کچھ گھبرا سا گیا اور میں خوش تھی کہ انور پہلے وار میں ہی مجھ سے شکست کھا کر بھاگ کھڑا ہوا۔ مرزا صاحب بھی میری تائید میں زور سے ہنسے۔ لیکن ان کی ہنسی نے کھانسی کی شکل اختیار کر لی اور ہم اس موضوع سے ہٹ کر کھانسی کے موضوع پر باتیں کرنے لگے۔ لیکن میں دیکھتی رہی کہ انور کی ہر حرکت اس تعجب کا اظہار کر رہی ہے کہ کیا شعر کہنا اور افسانے لکھنا واقعی دماغی تپ دق کی علامتیں ہیں۔ اور کیا دماغی تپ دق واقعی کوئی بیماری ہے اور کیا وہ بھی اس بیماری میں مبتلا ہے!

جب ہم سونے کے لیے اٹھے تو انور نے رشید کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالتے ہوئے آہستہ سے پوچھا۔

"بہت شوخ ہے انوری۔"

"شاعرہ ہے نا۔"

"شاعرہ ہے!"

"ہاں شاعرہ ہے۔"

"شعر کہتی ہے؟"

"ہاں خود شعر کہتی ہے!"

انور کا منہ تعجب سے کھلا کا کھلا رہ گیا۔ وہ میری طرف پاگلوں کی طرح دیکھنے لگا اور میں بے اختیار ہنستی' سیڑھیوں پر اڑتی ہوئی اپنے پلنگ پر آکر دھم سے گر گئی۔ میں نے انور کو خوب بنایا تھا۔

ایک روز آپا جان دادی جان کے پاس بیٹھی تھیں۔ بھیا رشید کالج گئے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہوئے تھے۔ رشیدہ ہماری خدمتگار نرگس سے کروشیا کے متعلق باتیں کر رہی تھی اور میں ایک چیونٹی کا مرثیہ لکھ رہی تھی جو اپنے ننھے سے منہ میں باجرے کا ایک دانہ دبائے اپنے سوراخ کی طرف بھاگی جا رہی تھی کہ میرے پاؤں تلے آکر کچلی گئی اور دانہ ایک اور چیونٹی اڑا کر چلتی بنی۔ مجھے اس قسم کے معمولی واقعات کئی بار پیش آچکے تھے۔ لیکن آج تو جیسے کسی نے میرے دل میں کسی بہت پرانے زخم کے نازک انگور کھرچ ڈالے ہیں۔ مجھے سامنے چیونٹیوں کے سوراخ میں اس کی بہنوں' بیٹیوں اور سہیلیوں کی چیخیں سنائی دینے لگیں۔

اتنے میں میرے کمرے کے دروازے کے سامنے سے انور گزرا۔ میرے سامنے دوات' کاغذ دیکھ کر ذرا رکا اور باہر سے بولا۔ "کوئی نظم کہہ رہی ہو انوری؟"

"ہاں۔"

"کیا موضوع ہے؟"

"وہی شاعری کا رسوائے عالم موضوع' شمع و پروانہ' گل و بلبل' اس موضوع کے سوا آخر شاعری ایسے نازک فن میں اور سما ہی کیا سکتا ہے؟"

انور کچھ حیران سا ہو گیا۔ میرا طرز گفتگو طنزیہ رنگ لیے ہوئے تھا۔ بولا۔ "اجازت ہے؟ آجاؤں اندر؟"

"ضرور!"

ہم بہت دیر تک اردو شاعری کے موجودہ دل پسند رجحانات پر گفتگو کرتے رہے لیکن اس گفتگو کے پردے میں دبی دبی آواز میں ہم دونوں نے کوئی ایسی بات بھی کہہ دی جس نے میرے دل کے سوئے ہوئے تاروں کو ایک دم جھنجھنا دیا اور مجھے یوں محسوس ہوا جیسے زمین میرے قدموں تلے سے کھسک گئی ہے' آسمان میرے سر پر سے ہٹ گیا ہے اور میں فضا کی لامحدود وسعتوں میں کسی ایسی منزل کی طرف اڑی جا رہی ہوں جو کائنات میں کہیں موجود نہیں۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

انور میرے پاس سے اٹھا تو جاتے ہوئے گنگنایا!

ایں رشتہ بہ انگشت نہ پیچی کہ دراز است

رشید کس رشتہ کی طرف اشارہ کر گیا! میں دیر تک سوچتی رہی اور سوچتے سوچتے میں نے یہ نتیجہ نکالا کہ سوچ کا انجام بھی ایک گہری سوچ ہے! بے معنی اور بے ہنگم سوچ!

مرزا صاحب ایک ہفتہ ہمارے ہاں رہے۔ ان دنوں ہم سب کی زندگی کے مقررہ نظام میں بہت تبدیلی واقع ہو گئی۔ بھیا رشید مجھے گھنٹوں نظر نہ آتے تھے۔ آپا جان اکثر میرزا صاحب اور دادی اماں کے پاس بیٹھی رہتی تھیں اور جب کبھی ادھر انور بھی آ نکلتا تو وہ دوپٹے کو کھسکا کر ماتھے پر لے آتیں اور اس کی طرف ——— لیکن مجھے یہ نہیں کہنا چاہیے۔

رشیدہ کو دیکھنے کی میں بہت مشتاق رہتی تھی کیونکہ وہ بہت حسین تھی اور اس کی آنکھیں اتنی صاف تھیں جیسے کوثر سے بھری ہوئی شفاف کٹوریاں اور اس کے ہونٹ اتنے نازک تھے جیسے شبنم سے بھیگی ہوئی گلاب کی نوشگفتہ کلیاں۔ وہ بھی اکثر مجھے نظر نہ آتی تھی۔ جب کبھی ملتی اور میں پوچھتی کہ بہن کدھر بیٹھی رہیں تو جواب دیتی نرگس کے پاس! حالانکہ نرگس میرے سامنے ہی سودا خریدنے چلی جایا کرتی تھی اور بہت دیر بعد واپس آتی تھی۔ مجھے محسوس ہونے لگا کہ اس گھر کا ہر فرد مجھ سے کترانے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن آخر اس کی وجہ؟ ——— راتوں کو اپنے چوڑے پلنگ پر لیٹ کر میں بہت دیر تک اس کی وجہ سوچتی رہتی۔ لیکن مجھے اس کے سوا کچھ نہ سوجھتا کہ کسی نے مجھے انور کے ساتھ شاعرانہ باتیں کرتے دیکھ لیا ہے اس لیے سب مجھ سے بدگمان نظر آ رہے ہیں۔ دادی اماں بھی مجھ سے کھنچی کھنچی رہنے لگیں۔ لیکن اس کی وجہ مجھے نرگس کی زبانی بعد میں معلوم ہوئی کہ انہوں نے "مانو" کے گودام میں بھوکا پیاسا بند ہو جانے کو بہت برا مانا تھا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

آخر مرزا صاحب کے کوچ کا وقت آ پہنچا۔ چار بجے گاڑی کانپور کی طرف چھوٹتی تھی۔ دن بھر تیاریاں ہوتی رہیں۔ دادی اماں نے لاہور کے مختلف تحفے ننھی ننھی ٹوکریوں میں بند کر کے مرزا صاحب کے سامنے پیش کیے۔ مرزا صاحب نے بہت انکار کیا اور کہا۔ "ہم ماتم پر آئے ہیں۔ کوئی خوشی کا موقع تو ہے نہیں کہ تحفوں سے لد کر جائیں۔" لیکن دادی اماں برابر یہی کہتیں رہیں کہ تم میرے اکرم علی کی یاد گار ہو۔ میں تمہارے بشرے میں اکرم بیٹے کا عکس دیکھتی ہوں تو میرا کلیجہ ٹھنڈا ہو جاتا ہے" —— حقیقت میں دادی اماں اس پیرانہ سالی میں بھی خاندانی وضعداری کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتی تھیں۔

جب موٹر تیار ہو گئی، اسباب وغیرہ باندھ لیا گیا تو میں بھاگ کر اپنے کمرے سے ایک کتاب اٹھا لائی اور انور کو پیش کرتے ہوئے کہا۔ "امید ہے آپ یہ کتاب بہت پسند کریں گے۔ بہت اچھی کہانیاں ہیں۔ انہیں ضرور پڑھیئے گا۔" میں کہنا چاہتی تھی کہ اس میں ان غمزدہ کشمیری لڑکیوں کی داستانیں ہیں جن سے محبت کی گئی اور جن سے محبت کرنے والے ناکام رہے یا بیوفا نکلے۔ اس میں ان خوشگوار لمحوں کی نقاشیاں ہیں جب کشمیری لڑکیاں ٹھنڈے جھرنوں میں اپنے منہ ہاتھ دھو کر، اور سیبوں کے سفید پھولوں سے اپنی گھنی سیاہ زلفیں سجا کر اپنے محبوب کے انتظار میں بیٹھ کر گنگنایا کرتی ہیں:

ے
کیوں اتنی دیر لگائی، اب پوپھٹنے کو آئی

لیکن میں اور کچھ نہ کہہ سکی۔ میں یہ سوچ رہی تھی کہ ادھر رشیدہ نے اپنا بیگ کھول کر ایک کتاب نکالی اور رشید کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "اسے آپ ضرور پڑھیئے گا!" خدا جانے وہ کونسی کتاب تھی اور اس میں کیا لکھا تھا۔ لیکن میں نے محسوس کیا کہ میری کتاب ایک اور روپ دھار کر میرے بھائی رشید کی انگلیوں میں کانپ رہی ہے۔ کانپ رہی ہے —— پیہم کانپ رہی ہے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

سب موٹر میں بیٹھ گئے۔ دادی اماں' آپا جان' رشید بھیا اور میں پھاٹک پر اداس کھڑے تھے۔ میں چاہتی تھی کہ روؤں۔ اس قدر روؤں کہ میرے آنسوؤں سے موٹر کا انجن تر بتر ہو جائے اور موٹر گھنٹوں یہیں کھڑی رہے۔ اتنے میں دروازے کے پیچھے سے مانو نے اپنا مربع شکل کا سر نکالا اور زور سے پکاری۔ "میاؤں!"

دادی اماں کے اچانک جیسے کسی نے گولی مار دی' بلبلا اٹھیں۔ میں بھی بھری پڑی تھی۔ کسی قسم کی کوشش کیے بغیر میں نے رونا شروع کر دیا اور آن کی آن میں آنسو میرے رخساروں سے ڈھلک کر میرے ٹھوڑی پر اکٹھے ہوئے اور میرے سینے پر ٹپ ٹپ گرنے لگے۔ میں نے پلٹ کر آپا جان اور رشید کی طرف دیکھا۔ وہ بھی بچوں کی طرح بلک رہے تھے۔ میرا پراگندہ دماغ گھومنے لگا۔ تھوک لگا کر آنکھیں بھگونے والے آج تو ایک اشارے کے منتظر بیٹھے تھے۔ میں نے موٹر کی طرف دیکھا۔ انور میری طرف غمگین انداز سے دیکھ رہا تھا اور آپا جان —— لیکن مجھے یہ نہیں کہنا چاہیے۔

اور جب موٹر گھرررر کرتی ہوئی آہستہ آہستہ رینگنے لگی تو میں نے دیکھا کہ رشیدہ موٹر کے عقبی شیشے سے دو ڈبڈباتی آنکھیں ایک طرف بکمال حسرت و یاس گاڑے جھانک رہی ہے۔ میں نے پلٹ کر پیچھے دیکھا۔ رشید بھیا سسکیاں بھر رہے تھے۔

اور دادی اماں؟ —— دادی اماں مانو پر ہاتھ پھیرتے ہوئے شاید یہ سوچ رہی تھیں کہ کیا یہ سب مانو کی دردناک میاؤں کا اثر ہے یا —— لیکن خدا جانے انھوں نے اور کیا سوچا۔

✽ ✽ ✽

www.iqbalkalmati.blogspot.com

سرخ ٹوپی

اس نے کپڑا نچوڑ کر الگنی پر لٹکایا اور منڈیر پر بیٹھے ہوئے کوے کو دیکھ کر بولی۔ ”تو جل مرے موئے کالے کلوٹے بھتنے، کائیں کائیں سے میرا مغز چاٹ لیتا ہے۔ گاؤں بھر میں کیا یہی منڈیر اچھی لگتی ہے تجھے؟“ اور اس نے اپنا پرانا جوتا پوری قوت سے منڈیر پر پھینکا۔ کوا کائیں کائیں کرتا پر پھڑپھڑاتا اوپر اٹھ گیا اور پھر نمبردار کے بالا خانے کا چکر کاٹ کر اس درے کی طرف اڑ گیا جدھر سے گاؤں کے نوجوان جو فوج اور پولیس میں ملازم تھے، اپنے بڑے بڑے بستر کاندھوں پر دھرے اور ہاتھوں میں جلیبیوں اور پیڑوں کی پوٹلیاں لٹکائے سال سال بھر بعد اپنی ماؤں، بہنوں اور خدا جانے کس کس سے ملنے آتے ہیں۔

ایک اور کوا اڑتا ہوا آیا اور منڈیر کی بجائے الگنی پر بیٹھ گیا۔ دو ایک بار جھولا تو دیوار میں دھنسی ہوئی چیڑ کی کمزور کیل ڈھیلی ہو گئی، باہر کھسکی اور الگنی کپڑے سمیت زمین پر آ رہی، کوا نمبردار کے بالا خانے کا چکر کاٹ کر اسی درے کی طرف اڑ گیا۔

اس نے کوّے کی بارہ پشتوں کو ایسے ایسے خطاب دیئے کہ پڑوسنیں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

چھتوں پر چڑھ آئیں۔ ادھیڑ عمر کی ایک بنی ٹھنی بیوہ ناک پر انگلی رکھ کر بولی۔ ”ہے ہے کیا غضب ہو گیا۔ کیا قیامت ٹوٹ پڑی۔ کوے نے الگنی گرا دی؟ قربان جاؤں، میں سمجھی بھورانی کو بچھو نے کاٹ لیا۔ اے یہ کوؤں کی کائیں کائیں تو بہت اچھا شگون ہے۔ یاد رکھو، تیرا سپاہی آج کل آیا کہ آیا۔“

”اسے چھٹی نہیں ملنے کی۔ وہ ابھی رنگروٹ ہے!“ اس نے گرد آلود کپڑے کو صابن کے میلے جھاگ میں بھگوتے ہوئے کہا۔ لیکن اس کا دل پکار رہا تھا، ”پگلی رنگروٹوں کو بھی چھٹی مل سکتی ہے اور وہ تو اب رنگروٹی پاس کر چکا ہو گا۔“ اور جب اس نے اس درے کی طرف دیکھا جہاں ابھی تک ایک کوا منڈلا رہا تھا تو اسے لہراتی ہوئی پتھریلی پگڈنڈی پر ایک نوجوان نظر آیا جس کے سر پر ہاتھ بھر لمبا طرّہ تھا اور جس کی پگڑی کا رنگ گہرا نارنجی تھا۔ جس کی مونچھیں بچھوؤں کے تنے ہوئے ڈنک کی طرح سرخ گالوں پر کنڈلی مارے بیٹھی تھیں۔ اور جس کے کپڑوں سے شُوں شاں کی آوازیں آتی تھیں۔ جس کے ہاتھ میں گلابی ریشم کا ایک بہت بڑا رومال تھا۔ اور کانوں میں عطر کی پھُریریاں۔ درے کی ہوا اس کے وجود سے عطر کی لپٹیں اڑاتی اس گھر پر منڈلانے لگی۔ وہ صابن کے میلے جھاگ کے برتن میں ہاتھ ڈالے اوپر فضا میں گھورنے لگی۔ اچانک ایک کوا ”سائیں“ سے اس کے صحن پر سے تیر کی طرح گزر گیا اور اس نے ایک ٹھنڈی آہ بھر کر، کپڑے کو دونوں ہاتھوں سے نچوڑتے اور مروڑتے ہوئے کہا۔ ”غارت ہو جائے ان موئے کوؤں کی نسل، دھلا دھلایا کپڑا غارت کر ڈالا۔ موئے ضدی، بخیل!“

ان مختصر میٹھے خوابوں میں بسنے والی مہری اس گھر میں اکیلی رہتی تھی۔ کوئی دس مہینے ہوئے اس کی شادی ہوئی تھی۔ گاموں کو اس نے اس شادی کے بعد پہلی مرتبہ دیکھا۔ پندرہ بیس دن اکٹھے گزارے۔ کھل کر بات کی نوبت ہی نہ آئی۔ ہر بات میں جھینپ اور ہر حرکت میں حجاب۔ وہ پانی مانگتا تو یوں معلوم

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بولتا جیسے یونہی بیٹھے بیٹھے کسی گیت کا ایک بول گنگنا دیا! اور وہ بات کرتا تو جیسے شہد کی مکھی کسی شیشے کے مرتبان میں بھنبھنا رہی ہے! اور جس روز ان کے گاؤں میں بڑا صاحب آیا اور گاموں کے ابھرے ہوئے پٹھوں' چوڑے چکلے سینے اور گٹھے ہوئے جسم کو دیکھ کر بولا۔ "دل تم لوگ اچا جوان ہے۔" تو اس روز مہری اپنی اچھی اچھی سہیلیوں سے بھی نہ بولی۔ اسے یوں محسوس ہونے لگا جیسے وہ ان چھوکریوں سے بہت بلند ہے جن کے گھر والے یا تو شہروں میں مزدوریاں کرتے ہیں یا کھیتوں میں دن بھر ہل چلاتے ہیں اور رات گئے گھر آکر سوکھی روٹیاں نگل کر اور کھاٹوں پر دراز ہو کر ایسے ایسے' وحشت ناک خراٹے بھرتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے ہوائی جہازوں کا ایک غول گڑگڑاتا جا رہا ہے!

اس روز گاموں کی گردن بھی کچھ اکڑ سی گئی اور چوپال پر سرحدی حقے پر لپٹے ہوئی میلے چیتھڑوں کو چھو کر بولا۔ "بھئی شرم آتی ہے۔ ایسا غلیظ حقہ پیتے ہوئے۔" اور چوپال والوں نے اسے یہ اعتراض کرنے میں حق بجانب سمجھا۔ کیونکہ گوری جلد والے صاحب نے اس کی جسمانی صحت کو بہت سراہا تھا اور پھر اس نے گاموں سے جس گرمجوشی سے ہاتھ ملایا تھا اس سے سب لوگ واقف تھے۔ حتیٰ کہ وہ لڑکیاں بھی واقف تھیں جو چھتوں پر' منڈیروں کی آڑ لیے صاحب بہادر کو گھورتی رہی تھیں!

مہری کو جہیز میں ایک بھی ریشمی کپڑا نہ ملا تھا۔ اور اس کے ماتھے کی مہر اور کانوں کے آویزے جو تانبے کے تھے' شادی کے دوسرے ہی دن اپنی چمک کھو بیٹھے لیکن جب گاموں فوج میں ملازم ہو گیا تو مہری کو پڑوسن کی سونے کی مہر اور جھمکے دیکھ کر کوئی خلش نہ ہوئی اور اس نے کئی بار محسوس کیا جیسے اس کے گلے میں دیسی چھینٹ کا چولا نہیں بدیشی ریشم کی قمیض ہے جو صابن کے جھاگ کی طرح مہین اور اس کی سانولی جلد کی طرح نرم ہے!

شادی کے پندرہویں روز جب گاموں اپنے بیاہ کے رنگین بکس سے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کپڑے نکال رہا تھا اور مہری اس کے لیے ایک ایسی توشک کے انتخاب میں مصروف تھی جسے چھو کر اس کے سیاہی بھائیوں کے رونگٹے کھڑے ہو جائیں تو چھت پر ادھیڑ عمر کی بیوہ پڑوسن نمودار ہوئی۔ آج اس نے سرخ ریشم کی قمیض پہن رکھی تھی جس کے حاشیے پر سبز ململ ٹکی ہوئی تھی اور اس کے کانوں میں سونے کے جھمکوں کے سروں پر دو ننھے موتی بھی جھم جھم ناچ رہے تھے جیسے اوس کے دو قطرے پھولوں پر پڑے کانپ رہے ہوں۔ مہری اسے دیکھ کر پل بھر کے لیے جل اٹھی مگر دراز گاموں کی چوڑی پیٹھ اور تیزی سے حرکت کرتے ہوئے بازو دیکھے تو اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کے کچے گھر کے صحن میں نئے بادشاہ کے چمکتے دمکتے روپوں کی چھن چھن بارش ہو رہی ہے!

دن ڈھلے گاموں گاؤں سے باہر نکلا' تو اس کے پیچھے نوجوانوں کا ایک انبوہ تھا۔ بوڑھا نائی گاموں کا بہت بڑا بستر اٹھائے قدم قدم پر نتھنوں میں نسوار چڑھاتا سب کے پیچھے رینگتا جا رہا تھا اور جب سب نوجوان گاؤں سے ایک میل دور درے سے گزر کر ایک طرف مڑ گئے تو پڑوسنیں گردنیں بڑھا بڑھا کر چلائیں۔ ”ہے ہے بہو رانی کیا ٹک ٹک گھور رہی ہے اپنے دولہا کو' کیا چوپٹ زمانہ آیا ہے! ہم نے وہ دن بھی دیکھے ہیں جب دولہا مر رہا تھا اور دلہن لجائی ہوئی کونے میں سمٹی بیٹھی تھی اور یہ دن بھی دیکھا کہ دلہن چھت پر بیٹھی اپنے دولہا کو یوں گھور رہی ہے جیسے یہ کوئی طوطا تھا کہ پنجرے سے نکل کر اڑ گیا اور پھر واپس نہ آئے گا!“

اور مہری کاندھے جھٹکاتی اٹھی۔ تیوری چڑھا کر' آنچل کو سینے پر پھیلایا اور سیڑھیوں سے اترتے ہوئے بولی۔ ”خالہ بی۔ میں اسے نہ دیکھوں تو کسے دیکھوں' میں دوسری لڑکیوں کی طرح گلیوں میں پھرتے ہوئے آوارہ لونڈوں کو تاکنے جھانکنے سے رہی!“

اور بیوہ پڑوسن اپنی دونوں نوجوان بیٹیوں کی طرف دیکھتی ہوئی بولی۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"کیا منہ پھٹ ہے!" اور دونوں نوجوان بیٹیاں ہاتھ نچا نچا کر کہنے لگیں۔ "آٹھ دس دن اکیلی رہی تو سب نشے ہرن ہو جائیں گے۔" پڑوسنیں ہنس دیں اور مہری نے نیچے اتر کر گاموں کے پرانے جوتے اور چپل جھٹک کر ایک پھٹی پرانی بوری میں رکھ دیے۔ تمباکو کا برتن ایک چنگیر سے ڈھانپ کر اوپر ایک بکس پر دھر دیا اور حقے کا پانی انڈیل کر اسے ایک کونے میں اٹکا دیا۔ کھاٹ باہر نکال کر بیٹھ گئی۔ جب شام ہوئی اور قریب ہی مسجد سے بوڑھے مولوی جی نے سریلی آواز میں اذان دی تو غیر ارادی طور پر اس کی نظریں دروازے پر جم گئیں۔ جہاں گاموں نماز کے بعد نمودار ہوتا تھا اور کھانا کھا کر کہتا تھا۔ "ذرا چوپال پر ہو آؤں؟" ——— "ہو آؤ۔" وہ جواب دیتی اور پھر اندھیری رات کو چپ چاپ واپس آکر مہری کے پاس بیٹھ جاتا اور کہتا ——— "پانی پلا دینا ذرا۔"

اور وہ ایلومینیم کا کٹورا اٹھا کر اس میں پانی ڈالتے ہوئے کہتی۔ "کہو تو شکر ڈال دوں۔"

کچی دیوار میں چھت کے قریب لوہے کی ایک زنگ آلود میخ سے سرخ رنگ کی ایک ٹوپی لٹکی رہتی تھی۔ جس پر سفید کھدر کا بنا ہوا چاند ستارے کا نشان بھی تھا۔ ایک روز مہری نے گاموں سے پوچھ ہی لیا کہ "یہ ٹوپی کس کی ہے؟ کون پہنتا ہے؟ یہاں کیوں لٹک رہی ہے؟" اور گاموں نے جواب دیا۔ "یہ ایک بہت اچھے زمانے کی یاد دلاتی ہے مجھے۔ کچھ سال گزرے ہمارے ملک پر ایک بہت اچھا وقت آیا تھا۔ ہندو' مسلمان اور سکھ سب آپس میں گھل مل گئے تھے۔ اکٹھے جلسے ہوتے تھے۔ اکٹھے بیٹھتے تھے کئی بار اکٹھے کھانا بھی کھا لیتے تھے۔ میں ان دنوں بچہ ہی تھا۔ لیکن ابا مجھے بتایا کرتے تھے کہ اس زمانے کو خلافت کا زمانہ کہتے ہیں۔ ابا قصبے سے گتا خرید لائے اور اس پر سرخ کھدر چڑھا کر' سفید کھدر سے کٹا ہوا چاند ستارا ٹانک کر یہ ٹوپی بنائی اور میرے سر پر رکھ دی۔ ابا اور گاؤں کے دوسرے بزرگ لمبے لمبے جھنڈے ——— کاندھوں پر رکھے گلیوں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کے چکر کاٹتے اور ہم بچے ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر ان کے پیچھے پیچھے چلتے اور گایا کرتے تھے

انت الھادی انت الحق

لیس الھادی الا ھو .... "

اور جب مہری نے گاموں سے پوچھا کہ اس کا مطلب کیا ہے تو وہ نہایت باوقار آواز میں بولتا۔ "اس کا مطلب یہ ہے کہ گناہ نہ کرو۔ سچ بولو۔ نمازیں پڑھا کرو اور بڑوں کا ادب کرو۔"

مہری پر گاموں کی علمیت کا بھی بہت زیادہ رعب پڑ گیا تھا۔ گاموں نے اسے یہ بھی بتایا تھا کہ "ابا کو پولیس پکڑ کے لے گئی اور چھ مہینے وہ جیل میں چکی پیستے رہے۔ واپس آئے تو بیمار تھے۔ چارپائی سے لگ گئے۔ آخر چل بسے۔ اگر ہمارے نمبردار جی سے ان کی دشمنی نہ ہوتی تو انہیں کون قید کرتا۔ وہ تو بس "انت الہادی انت الحق" زور زور سے گایا کرتے تھے۔ سرکار کے خلاف انہوں نے کبھی کچھ نہیں کہا۔ یہ سرخ ٹوپی ان دنوں کی نشانی ہے۔ پڑی رہے۔کبھی کام آئے گی۔"

اور گاموں کے چلے جانے کے بعد جب کبھی مہری کی نظریں ٹوپی پر پڑتیں، تو وہ آنکھیں جھپکا جھپکا کر اور کلائیوں میں کنگن گھما گھما کر سوچا کرتی کہ کس کام آئے گی یہ ٹوپی؟ کون پہنے گا اسے؟ اور سوچتے سوچتے وہ اس نتیجے پر پہنچتی کہ گاموں نے، جو بے مطلب ایک لفظ تک منہ سے نہیں نکالتا' یہ بہت بے مطلب بات کہی۔

آٹھ دس مہینے گزر گئے اور اس نے سن رکھا تھا کہ سال کے بعد سپاہیوں کو چھٹی ملتی ہے۔ پچھلے چند دنوں سے ایک کوا بلا ناغہ اس کے مکان کی منڈیر پر بیٹھ کر اس زور سے چیختا رہتا کہ اس کی دم ہر کائیں کے ساتھ جھک کر زمین کو چھو لیتی تھی اور ننھے بچے چونک کر بلبلا اٹھتے۔ پڑوسنیں جی ہی جی میں

کڑھتیں کہ کوے کا مکان کی منڈیر پر بیٹھنا' ان کے نزدیک بہت اچھا شگون تھا اور وہ نہیں چاہتی تھیں کہ مہری اچھے دن دیکھے۔ کیونکہ وہ ذرا منہ پھٹ تھی اور بات کرتے وقت یہ نہیں سوچتی تھی کہ اس کی مخاطب کے بدن پر ریشمی قمیض ہے اور کانوں میں سنہری جھمکے!

ان آٹھ دس مہینوں میں گاموں کی دو چٹھیاں بھی آئیں جن میں اس نے لکھا کہ :

"ہم دن بھر دوڑتے بھاگتے رہتے ہیں۔ ہماری چھاؤنیاں بہت بڑے بڑے شہر ہیں۔یہاں کی صفائی مسجدوں کی سی ہے۔ ہمیں صبح کو دال اور شام کو گوشت ملتا ہے۔ یہاں میرا ایک دوست ہے جس کے وطن میں لنگیاں بہت اچھی بنائی جاتی ہیں۔ میں تمہارے لیے ایک لنگی ضرور لاؤں گا۔ افسر لوگ عام طور پر شہر نہیں جانے دیتے۔ عید کے روز ہمیں چھٹی تھی۔ میں شہر گیا تو ایک دوکان پر ایسے ایسے خوبصورت جھمکے دیکھے کہ تم پہنو تو الف لیلےٰ کی لال پری لگنے لگو۔ یہاں کپڑا سستا ملتا ہے اور تمہاری ریشمی قمیض صرف ڈیڑھ روپے میں بن سکتی ہے۔ میں تمہارے لیے چار قمیضیں لے آؤں گا۔ اور تم اداس نہ رہا کرو۔ نمازیں پڑھا کرو۔ قرآن شریف پڑھ سکتی ہو تو صبح کو ضرور پڑھا کرو۔ اس سے برکت ہوتی ہے۔ یہاں مجھے ایک خوبصورت قرآن پاک ملا ہے جس کی جلد چمڑے کی ہے اور جس کے صفحوں کے اردگرد بیل بوٹے بنے ہوئے ہیں۔ مکان کی لپائی کی ضرورت ہو تو کرا لینا۔ رقم میں آکر ادا کردوں گا اور باقی سب خیریت ہے۔"

اس قسم کی دو چٹھیاں مہری کو پہنچیں اور گو وہ قرآن پاک کے سوا اور کچھ نہ پڑھ سکتی تھی' لیکن گاؤں کے مولوی جی نے جو بیک وقت مدرسے کے اول مدرس' مسجد کے امام اور برانچ پوسٹ ماسٹر تھے' اسے جو کچھ پڑھ کر سنایا' اس نے اپنے دماغ میں محفوظ کرلیا۔ اس نے کسی کے آگے ان چٹھیوں کی بات

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

تک نہ کی۔ لیکن عام لوگوں کی زبان سے اس نے اپنے پردیسی سپاہی کے خط کے الفاظ سنے تو اسے مولوی جی پر بہت غصہ آیا اور یہ سن کر تو اس کے تعجب کی کوئی حد نہ رہی کہ نمبردار جی کل چوپال پر بیٹھے کہہ رہے تھے کہ گاموں بڑا بدمعاش ہے۔ ریشمی قمیضوں اور سنہرے جھمکوں کی باتیں بدمعاش ہی خطوں میں لکھا کرتے ہیں۔ اور گو مہری نمبردار کی ان باتوں کا مطلب نہ سمجھی، لیکن وہ ساری رات جاگتی رہی اور صبح اٹھ کر کپڑے دھونے بیٹھی تو کوے نے اسے اس قدر تنگ کیا کہ اس پر اپنا پرانا جوتا پھینکنے کے سوا اور کچھ نہ بن پڑی۔

بھلا ہو بوڑھی نائن کا، وہ ہر ہفتے مہری کے ہاں جاتی اور اسے لون مرچ تیل اور صابن گاؤں کی دوکانوں سے خرید کر دے جاتی اور پچھلے چند دنوں سے تو وہ بلا ناغہ مہری کے پاس آنے جانے لگی تھی۔ گھنٹوں اس کے پاس بیٹھی رہتی اور کہتی۔ "اتنی بڑی بڑی چیزیں نہ اٹھایا کر بیٹی۔ یہ اچھا نہیں ہوتا۔"

اور پھر ایک ہفتہ کے بعد مہری کے ہاں بچہ پیدا ہوا۔ چاند سا چہرہ دیکھ کر اسے اپنا گاموں یاد آگیا جو چھاؤنی کے بڑے بڑے کمروں میں دنیا کے اتنے بڑے واقعہ سے بے خبر گھومتا پھر رہا ہو گا! اس نے نائن کو چار پیسے دے کر گاموں کے نام ایک چٹھی لکھوائی کہ ننھے کا کیا نام رکھا جائے۔!

جب نائن اس کے پاس بیٹھی ایک سیپی میں ننھے کے لیے دوا تیار کر رہی تھی تو مہری کی نظر سرخ ٹوپی پر جا پڑی جس پر سفید کھدر سے کٹا ہوا چاند ستارا چمک رہا تھا۔ اور پھر اس کے پہلو میں ننھا رونے لگا۔ اور اچانک اسے ٹوپی کا مصرف معلوم ہو گیا۔

وہ جی ہی جی میں بہت خوش ہوئی اور سوچتی رہی۔ "میرا گاموں تو کوئی بے مطلب بات نہیں کرتا۔ میرے گاموں کی نظریں کتنی دور پہنچتی ہیں!"

اسی شام کو جب اس پر نیند کی مستی چھا رہی تھی اور نائن دیوار سے لگ کر اونگھ رہی تھی تو دروازہ کھلا اور گاموں ہانپتا اندر آیا۔ کاندھے سے بسترا

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اتار کر زمین پر پٹخ دیا اور مہری کی طرف دیکھ کر بولا۔ "کیا بات ہے' بیمار تو نہیں ہو مہری؟"

مہری چونک پڑی۔ اس کی رگوں میں خون کھولنے لگا۔ وہ اس شدت سے لرزی کہ اس کے پہلو میں لیٹا ہوا ننھا سوتے میں بلبلا اٹھا۔ گاموں سب کچھ سمجھ گیا اور مسکرایا لیکن یہ مسکراہٹ بہت بے رونق سی تھی!

بوڑھی نائن نے اٹھ کر گاموں کے سر پر ہاتھ پھیرا اور اس کے کاندھے کو اپنے "نسوار آلود" ہونٹوں سے بوسہ دیا۔ کڑوے تیل کا دیا طاقچے میں دم بخود پڑا تھا اور سارے کمرے میں زرد زرد روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ بڑھیا بولی۔ "میرے لال تجھے لاکھ لاکھ مبارکیں۔ یوں بھی کوئی نوکری سے آتا ہے۔ نہ گز بھر لمبا طرہ۔ نہ ریشمی قمیض' نہ گلابی لنگی' جیسے چوری چھپے کھسکتا ہوا گلیوں میں ادھر آنکلا۔ آخر یہ بھی کیا آنا ہوا۔" اور گاموں نے اپنا بستر کھول کر بڑھیا کو ایک کپڑا نکال دیا اور کہا۔ "لے خالہ یہ تیری نذر۔" اور جب وہ بستر کو لپیٹ رہا تھا تو مہری نے ایک طرف سونے کے جھمکے' ریشمی قمیضیں اور رنگ دار لنگیاں پڑی دیکھیں۔

بوڑھی نائن گاموں کو دعائیں دیتی گھنٹہ بھر کے لیے گھر کو چلی گئی۔ گاموں مہری کے قریب گیا اور جھک کر بولا۔ "مہری"! مہری کانپ اٹھی! اور اپنے کمزور ہاتھ بلند کر کے اس کے کاندھوں پر رکھتے ہوئے بولی۔ "کتنے مہینوں کی چھٹی ملی ہے؟"

گاموں نے ادھر ادھر دیکھا۔ خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور مدھم آواز میں بولا۔ "میرا نام کٹ گیا!"

باہر کوئی بھولا بھٹکا کوا ان کے مکان کی چھت پر سے کائیں کائیں کرتا گزر گیا! مہری کے پہلو میں سویا ہوا ننھا بچہ سوتے میں اچانک کانپ کر رہ گیا۔ مہری پھٹی پھٹی نظروں سے اسے گھورتی ہوئی بولی۔ "کس لیے؟"

www.iqbalkalmati.blogspot.com

وہ بولا۔ ''میں پکا ہونے والا تھا اس لیے میرے افسروں نے میرے چال چلن کے بارے میں نمبردار سے پوچھ بھیجا تھا۔ نمبردار نے لکھ دیا کہ یہ خطرناک آدمی ہے۔ اس کا والد ''انت الهادی انت الحق'' پڑھا کرتا تھا اور اس کے گھر میں ابھی تک سرخ رنگ کی ٹوپی لٹک رہی ہے۔ جس پر چاند ستارے کا نشان ہے ـــــ افسروں نے مجھے برخاست کر دیا ہے!''

مہری اسی طرح لیٹی رہی۔ اس نے کوئی حرکت نہ کی اور جب گاموں نے جھمکے نکال کر اس کے سینے پر رکھ دیئے تو اس نے انہیں چھوا تک بھی نہیں۔ بولی۔ ''آج کل سونے کا کیا بھاؤ ہے؟ جھمکے بک جائیں تو کتنے دن بے فکری میں گزریں گے؟ اور شاید یہ سلی سلائی قمیضیں بھی کوئی خرید لے!''

گاموں بھونچکا سا رہ گیا۔ دیوار پر دوڑتی ہوئی ایک چھپکلی سرخ ٹوپی سے ٹکرائی اور ٹوپی گرد و غبار کا ایک مرغولہ اڑاتی گاموں کے قدموں میں آن گری! اور باہر اندھیرے میں کوئی بھولا بھٹکا کوا کائیں کائیں کرتا نمبردار کے بالا خانے سے ٹکرا کر پھڑپھڑایا اور جانے کدھر اڑ گیا۔

✻ ✻ ✻

www.iqbalkalmati.blogspot.com

پرچھائیاں

سر پر فولادی خود' بدن پر زرہ بکتر' نیزہ تانے' تلوار سجائے میں افق کی طرف بڑھا جا رہا تھا۔ میرے وطن کی فوجیں جا چکی تھیں اور مجھے اپنی بیمار محبوبہ کو تسلیاں دینے میں دیر ہو گئی۔

ایک تنکا اڑتا ہوا آیا اور میری زرہ کی مہین جالی میں اٹک گیا۔ میلا پیلا سا رنگ۔ کمزور اور ناتواں۔ عرصے کی کشمکش اور اضطراب کے بعد سکون پا کر سونے ہی کو تھا کہ ایک اور تند جھونکا آیا۔ تنگ آکر اس نے ایک کروٹ بدلی اور ابھر کر میرے شانے سے چمٹ گیا اور بولا۔ ''تم اس ویرانے میں کیوں بھٹک رہے ہو؟۔ یہاں تو وہی چیزیں پھرا کرتی ہیں جن کے وجود سے کائنات کو کسی قسم کے فائدے کی امید نہ ہو۔ تم تو مجھے آدم کی اولاد معلوم ہوتے ہو' اور آدم کی اولاد کو آقا نے بڑی قوتیں دے رکھی ہیں۔ (کروٹ بدل کر) ـــــ میں اگر آدم کے ان فرزندوں کے نام گننے لگوں جنہوں نے مجھے توڑا مروڑا۔ روندا اور ٹھکرایا تو اسی میں تمہاری ساری عمر بیت جائے۔ آخر انسان کی عمر ہوتی ہی کیا ہے۔ میں ابھی تک یہ نہیں سمجھ سکا کہ تمہیں اشرف

www.iqbalkalmati.blogspot.com

المخلوقات اور خلیفتہ اللہ کا لقب کس لیے دیا گیا ہے۔ میں تو تمہاری بے بضاعتی دیکھ کر مارے ہنسی کے لوٹ پوٹ ہو جاتا ہوں! (کروٹ بدل کر)——اسی ویرانے میں ایک روز بہت بڑی جنگ ہوئی تھی۔ میں ان دنوں ایک کل کا جزو تھا۔ میرا ایک بھائی کل سے جدا ہو کر اڑتا ہوا ایک بہادر سپہ سالار کی گردن پر جا بیٹھا اور سپہ سالار نے' جس کے ہاتھ کے اشارے سے میدان کا رنگ آن کی آن میں کچھ کا کچھ ہو جاتا تھا وحشیانہ انداز میں گھبرا کر' اس زور سے اس پر ہاتھ مارا جیسے ہوا میں سے اس پر اڑتا ہوا اژدھا آن گرا ہے۔ زخمی جسموں کو لتاڑنے والے اور خون کی ندیوں میں تیرنے والے اس الوالعزم انسان کی روح میرے بھائی کے ذرا سے مس سے اس زور سے لرزی کہ وہ قہقہہ روکنے کی کوشش میں اپنے آپ کو سنبھال نہ سکا اور زمین پر آرہا۔ وہیں ایک گھمسان کارن پڑا۔ اور وہ بے چارہ وہیں منوں ریت کے نیچے دب کر رہ گیا۔ مدت کے بعد اپنے کل سے جدا ہو کر میرا بھی ادھر سے گزر ہوا۔ ریت کے نیچے سے گھٹی گھٹی آواز آئی۔ "بھئی اب میں یہاں پڑے پڑے تھک گیا ہوں۔ سنا؟ اب یہاں ایسا طوفان کب آئے گا کہ مجھ پر سے یہ منوں ریت اڑ جائے اور میں تمہیں گلے لگالوں ۔ میں اپنے ہمجنسوں کے لیے ترس گیا ہوں۔ یہاں تو ذرا ذرا سے ٹھنڈے اور گرم ذروں کے سوا ہے ہی کچھ نہیں اور یہ سب میرے کان میں سرگرشیاں کرتے ہیں۔ بہت بڑے بول بولتے ہیں۔ کہتے ہیں۔ ہم حقیر ذرے نہیں ہم ایک دنیا ہیں۔ ہم ایک جہان ہیں غیرفانی اور ابدی——اور جب سورج زمین پر اتر آئے گا اور پہاڑ روئی کے گالے بن کر اڑنے لگیں گے تو بھی ہم فنا نہیں ہوں گے۔ ہم فضا بن جائیں گے ہم اس خلاء میں بے آواز گھومتے پھریں گے۔ جو نہ جانے کتنی وسیع اور کس قدر تنگ ہو گئی —— بھئی مجھ سے یہ بڑے بول نہیں سنے جاتے' کوئی نوید سنا"!——میں ریت میں سر ڈال کر پکارا۔" بے فکر پڑا رہ۔ کوئی دن میں تو پھر اپنے آپ کو نیلے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

آسمان اور بھوری زمین کے درمیان بسیط خلا میں چکر کاٹتے لوٹتے اڑتے رقصاں پائے گا۔" ——— پوچھنے لگا۔ "کیوں؟" میں نے جواب دیا۔ "ارے اب اس زمین پر مہا بھارت اور پانی پت کی لڑائیوں کی یاد تازہ ہونے والی ہے نا! ——— جس طرح توریت کے بوجھ سے تھک گیا ہے' اسی طرح غلام بھی غلامی کی چٹانیں اپنی پیٹھ سے اتار کر پرے پٹخنے والے ہیں" ——— اور تنکا کروٹ بدل کر میرے شانے پر سے اڑا اور ایک سوکھی جھاڑی میں جا کر سو رہا!

سامنے آک کا ایک بوٹا تھا جس کے سائے میں اس کے اپنے سوکھے پتے تھے اور جس کے ایک مرجھائے ہوئے اودے سے پھول پر ایک مکوڑا بیٹھا اپنی ننھی گول آنکھوں سے مجھے گھور رہا تھا۔ مجھے اپنی طرف متوجہ پا کر وہ اڑا اور کمان کا سا خم کھا کر میرے قدموں میں آن گرا۔ سبز اور سرخ پروں کو سمیٹتے ہوئے بولا۔ "کیا حال ہے دوست؟ تو مجھے نہیں جانتا لیکن میں تجھے جانتا ہوں۔ اس لیے کہ مکوڑہ ہوں اور تو انسان ہے۔ تو عقل و خرد کا خزینہ اور میں ایک ناکارہ سی چیز۔ اس لیے تو مجھے بھول گیا۔ اور میں تجھے نہیں بھولا" ——— اس نے ایک بار پھر پر کھول کر سمیٹے جیسے مجھ پر پھبتی کس رہا ہے۔ پھر وہ اپنی لمبی مونچھوں کو ہلاتے ہوئے بولا۔ "ارے تو پرے کیوں کھسکا جا رہا ہے؟ میں انسان کے جسم پر بیٹھ جاؤں تو کیا قیامت نازل ہو جاتی ہے؟ تھرتھری سی دوڑ جاتی ہے تمہاری رگوں میں! تم شیر کے جبڑوں میں ہاتھ رکھ کر اسے پھاڑ ڈالتے ہو' اور مجھ ننھے سے مکوڑے کی پتلی ٹانگوں کے مس سے جھرجھری سی تیر جاتی ہے تمہارے لہو میں! میں ابھی تک تمہاری فطرت نہ سمجھ سکا۔ مدتوں میں شہر کے قریب ایک آک پر آشیانہ بنائے بیٹھا رہا اور آدم کی اولاد کی حرکات کو بغور دیکھتا رہا ——— اندھیری راتوں میں مجھے تمہاری فطرت کے مطالعہ کا خاص موقع ملا اور میں نے دیکھا کہ تمہارے سائے دبے پاؤں خالی ہاتھ گلیوں میں گھستے ہیں اور پوٹلیاں اٹھائے باہر آ کر اندھیرے میں کھو جاتے ہیں! ——— کھڑکیاں کھلتی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہیں اور نازک جسم مضبوط ہاتھوں میں جکڑ لیے جاتے ہیں!—— کئی بار مجھے نیند آنے لگتی ہے کہ "کرچ" کی آواز آتی ہے اور کسی معصوم کی روح سرد ھنتی ہونٹ کاٹتی شدت غم و غصہ سے فضا میں کروٹیں بدلتی ستاروں کے دیس میں اڑ جاتی! لمبی لمبی چمنیوں سے دھوئیں کے طوفان اٹھتے اور ہزاروں سیاہ فام انسانوں کی دبی دبی آہیں ان کے ساتھ لپٹی ہوئی فضائے بسیط میں گھل کر رہ جاتیں —— لمبی لمبی شعلہ بار تقریریں ہوتیں—— اور تقریریں کرنے والے خانقاہوں اور حجروں کی آڑ میں بے گھر دوشیزاؤں کی عصمتوں پر نفسانیت کی عفونتیں لپیٹ دیتے—— بالا خانوں کی ایک قطار میں رنگین شیشوں والی کھڑکیاں کھلتیں' خوبصورت جسم اپنے حسن و جمال کا عریاں مظاہرہ کرنے کے لیے آگے جھکتے' سکوں کی کھنکھناہٹ سنائی دیتی اور انسانی روحیں روشندانوں کے رستے سے نکل کر باہر منڈیروں پر بیٹھی سسکتی رہتیں اور کچھ دیر بعد پھر اندر جا کر تپتے اور دھڑکتے سینوں میں سما جاتیں! ایک روز میں نے ان ڈھکی چھپی باتوں سے تنگ آکر ایک چھلانگ لگائی اور ایک مسافر کی پگڑی پر آن بیٹھا جو شہر سے بیس میل دور اپنی محبوبہ کو ملنے جا رہا تھا۔ راہ میں اس نے ایک گیت گایا جس کا مفہوم یہ تھا۔ "اے میری پردیسی محبوبہ آ۔ کسی پیپل کی گھنیری چھاؤں تلے بیٹھ کر الف لیلہ کی کہانیاں پڑھیں کیونکہ انسانوں کی کہانیوں میں فریب ہے اور جنوں پریوں اور دیوؤں کی داستانوں میں یہ بات نہیں۔ انسان اوپر سے مسکراتا ہے مگر اندر سے اس کے دل کے ناسور رس رہے ہوتے ہیں۔ وہ ظاہرا" روتا ہے مگر اس کی روح میں چھپی ہوئی بیشمار مسرتوں کا کوئی اندازہ نہیں کر سکتا۔ انسان ریاکار ہے۔ دیو اور جن سچے ہیں۔ جو محسوس کرتے ہیں وہی کہتے ہیں۔ ہنستے ہیں تو سراپا قہقہہ ہوتے ہیں اور روتے ہیں تو سراپا گریہ!" —— مجھے یہ گیت پسند آیا اور میرا وقت مزے سے کٹتا گیا۔ لیکن اچانک اس کے گیت نے ایک اور رنگ اختیار کر لیا اور میں جیسے بھڑکتی ہوئی آگ میں بھنا

www.iqbalkalmati.blogspot.com

جا رہا ہوں۔ وہ گا رہا تھا۔ "اے میری معصوم محبوبہ' غازہ لگانے' ہاتھوں میں مہندی رچانے اور زلفوں میں پھول سجانے کا یہ وقت نہیں۔ میں نے تلوار سونت لی ہے۔ تو بھی ایک ننھا سا خنجر مرہم پٹیاں اور ایک مشکیزہ اٹھا لے اور آ ——— ہند کے ان لاکھوں جاں نثاروں کی صف میں ہم بھی شامل ہو جائیں جو موت کے پھیلے ہوئی بھیانک جبڑے سے بے پروا تن کر ڈٹ گئے ہیں۔ اور جنہیں آسمانوں پر سے ان کے بزرگوں کی روحیں دیکھ رہی ہیں اور خوشی سے جنت کی کلیاں دامنوں میں سمیٹے ان کے سروں پر گنگناتی پھر رہی ہیں! ہند کی اجڑی ہوئی جنت ہمارے بزرگوں کے دامنوں کی ان کلیوں اور ہمارے لہو کے چھینٹوں سے پھر آباد ہونے کو ہے کہ جنگلوں میں غریب اور کمزور ہی مرتے ہیں۔ امیر اور قوی اپنے محلوں میں اسی شان و شوکت سے داد عیش دیتے رہتے ہیں۔ تم میری باتیں سن کر گھبرا گئے ورنہ تمہارا یہ ہانپنا کیا معنی رکھتا ہے۔ شمشیر تو تم نے بھی سونت رکھی ہے۔ مگر تمہاری معصوم محبوبہ کدھر ہے؟ مشکیزے مرہم اور پٹیوں سمیت!" ——— مکوڑے نے آنکھیں مٹکا کر پر پھیلا دیئے اور پھر سے آک کے اسی مرجھائے ہوئے اودے پھول پر جا بیٹھا!

میں نے دو چار قدم ہی اٹھائے تھے کہ کسی کی پھٹی پھٹی آواز آئی ——— "اے نوجوان کہاں بھاگا جا رہا ہے؟ معلوم ہوتا ہے میدان جنگ کا قصد کر رکھا ہے تنکے اور مکوڑے کی تو سن لی اس بوڑھے کھوسٹ کی بھی پتا سن لے جس کے خول میں' آج کل چمگادڑیں ڈیرہ جمائے ہوئے ہیں!"

میں نے پلٹ کر دیکھا تو بہت پرانے وقتوں کا ایک درخت ویرانے میں سر اٹھائے کھڑا تھا ——— کالا بھجنگ۔ ٹنڈ منڈ' کبڑا اور ماندہ' بولا۔ "مجھے دیکھ کر متعجب کیوں ہو رہا ہے؟ کیا تجھے اپنا باپ یاد نہیں جس کی سفید براق داڑھی اور زرد ہلدی سا چہرہ دیکھ کر موت بھی مدت تک ہچکچاتی رہی کہ اس کا کیا کیا جائے۔ اے بیٹا میں نے دنیا دیکھی ہے۔ تو سمجھتا ہو گا کہ اس ویرانے میں ریت

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کے ذروں کے سوا مجھ سے کسی کا سابقہ نہیں پڑا۔ کچھ قریب آجا۔ میری آواز ذرا بھاری ہے اور میں ڈرتا ہوں کہ اگر مجھ پر کسی بدخواہ کی نظر پڑ گئی تو کلہاڑی سے مجھے چیر ڈالے گا ــــــ مدتوں تند آندھیاں اور پیچ کھاتے بگولے مجھ تک نوع انسان کی سانس سانس کا پتہ لاتے رہے' اور اکثر ایسا بھی ہوا کہ چاندنی راتوں میں جب سارا میدان خوابوں کی سرزمین میں تبدیل ہو جاتا ' میں آس پاس کے شہروں کے بسنے والوں کو روتا' بسورتا' ہنستا کھیلتا اور جانے کیا کیا کرتے دیکھتا!ــــــ اور مجھے چپ چاپ فضا میں ننھے ننھے انسانی دل ایسے بے ہنگم انداز میں دھڑکتے محسوس ہوتے کہ میری چیخیں نکل جاتیں اور آس پاس کے شہروں میں بسنے والے آنکھیں ملتے' جاگ اٹھتے اور پکارتے۔ "بوڑھا درخت چلاّیا ہے یقیناً آج آندھی آئے گی ــــــ" سو مجھے معلوم ہونا چاہیے کہ یہ آندھیاں اور یہ بگولے کسی نہ کسی دل جلے کی وارفتہ مزاجی کے ثبوت ہیں۔ اوہ! میں نے اپنی اتنی طویل عمر میں بہت سے انقلاب دیکھے ہیں اس لیے میں ذرا باغی سا بوڑھا واقع ہوا ہوں۔ جب مجھ پر جوانی تھی اور میری ٹہنیاں گنجان پتوں کے سبز لبادے پہن کر جھوما کرتی تھیں' میرے سینے میں کئی چنچل پرندوں کا بسیرا تھا جن سے مجھے محبت تھی اور بچے! تجھے جاننا چاہیے۔ مجھے ان چنچل پرندوں نے بہت دھوکے دیئے۔ میرے پتے گرے تو پھر سے اڑ گئے یہ نہ سوچا کہ وہ اس دوست کو چھوڑے جا رہے ہیں جس کا کام آٹھ پہر انہیں چومنا اور جھولے جھلانا تھا ــــــ میری جوانی کے دنوں میں ایک روز ایک مرد اور ایک عورت میرے سائے تلے آن بیٹھے' بہت دیر تک یونہی چپ چاپ بیٹھے رہے۔ دونوں کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے اور دونوں کے ہاتھ میں رعشہ تھا!ــــــ روتے ہوئے دونوں اٹھے۔ سسکیاں بھرتے ہوئے ایک دوسرے کو گلے سے لگا لیا اور بچے! تو شاید باور نہ کرے لیکن جب انہوں نے ہونٹوں سے ہونٹ ملائے تو میری سب سے اونچی ٹہنی کی آخری پھننگ نے ستاروں کے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

دیس میں فرشتوں اور حوروں کے ایک جمگھٹ کو مسکراتے دیکھا۔ وہ جدا ہو گئے! میں نے غمزدہ ہو کر اس روز بہت سے پتے جھٹک دیئے۔ مدتوں مجھے ان کا تصور ستاتا رہا۔ آندھیوں اور بگولوں نے مجھے ان کی بے سروپا خبریں سنائیں اور آخر ایک روز افق پر سے گرد و غبار اٹھا۔ گرانڈیل سپاہی تلواریں تانے بڑھے اور اس ویرانے کے چپے چپے پر خون کی نہریں بہہ گئیں۔ وہ نوجوان ایک جرنیل کے لباس میں میرے سائے تلے ستانے بیٹھ گیا۔ اس کی تلوار سے لہو ٹپک رہا تھا اور گٹھے ہوئے جسم سے خون آلود پسینہ' اچانک ایک جھونکے سے میرا سارا وجود کانپ گیا۔ سامنے وہی عورت ننھے سے مشکیزے سے زخمیوں کو پانی پلا رہی تھی۔ وہ جرنیل کو دیکھ کر لپکی۔ میرے سائے میں انہوں نے ایک دوسرے کے ہونٹ چومے اور بچے! تو سچ مان لے کہ اس روز میں نے اس کرۂ خاکی کا دل دھک دھک کرتا سنا!——وہ دونوں چنگھاڑتے ہوئے میدان سے اڑتے ہوئے گرد و غبار میں گم ہو گئے اور میں نے ایک آہ بھری۔ ایک بگولا طیش میں بل کھاتا اٹھا اور مرے ہوئے سپاہیوں کے خون آلود لبادے پھڑپھڑاتا ——افق کی طرف روشنی کے مینار کی سی شکل اختیار کرتا غائب ہو گیا میں نے آنسوؤں کا نمکین ذائقہ بھی چکھا ہے۔ خون کے قطروں کی گرم گرم چاشنی سے بھی لطف اندوز ہوا ہوں۔ خاموشیوں کی لذت بھی اٹھائی ہے۔ تلواروں کی جھنکار کا نغمہ بھی ابھی تک میرے بوڑھے کانوں میں گونج رہا ہے۔ اب بہت ضیعف ہو چکا ہوں۔ مگر اندھیری راتوں کو جب آندھیاں چلتی ہیں تو میرے خول سے پھٹی پھٹی آواز میں ایک خوفناک گیت بلند ہوتا ہے——ایک انقلابی گیت——جسے تم سن لو تو افق کی طرف بھاگ جاؤ جہاں آج کل ہند کے سپوت اس کی بیڑیاں کاٹ رہے ہیں .... نوجوانوں کا گرم خون فولاد کے لیے تیزاب کا حکم رکھتا ہے۔ مدتیں گزریں کوئی بات سننے والا نہ ملا۔ تم نوجوانوں سے مجھے محبت ہے۔ تیری تلوار کو میں خاک اور خون میں لتھڑا ہوا دیکھ رہا ہوں۔ لے' رخصت!"——اس نے اپنے خول سے ایک تیز بھیانک

www.iqbalkalmati.blogspot.com

نعرہ بلند کیا۔ میں نے اسے کمال عزت و احترام سے چھوا۔ اچانک میرے پہلو سے ایک بگولا اٹھا اور خاکستری آسمان سے باتیں کرنے لگا! میں آگے نکل گیا!

ایک سوکھی جھاڑی کی جڑوں میں ایک چڑیا چونچ کھولے خشخاش سی آنکھیں نکالے مجھے دیکھ رہی تھی۔ اس کا سفید سینہ سانسوں کے اتار چڑھاؤ سے لرز رہا تھا۔ اس نے گرمی کی شدت اور پیاس کی کوفت سے اپنے پر پھیلا رکھے تھے۔ اور تمازت سے بچنے کے لیے کبھی کبھی ایک موٹی جڑ کے تلے سر دبانے کی کوشش کرتی تھی۔ مجھے اپنے اس قدر قریب دیکھ کر بولی۔ "جانے مجھے اب تم انسانوں سے کیوں ڈر لگتا ہے! خدا کے لیے میرے قریب نہ آنا۔ میں غریب دہل کر مر جاؤں گی۔" میں حیران ہو کر بولا "آخر بات کیا ہے؟" کہنے لگی۔ "میری بپتا سنو گے کیا؟ تم جانو چڑیا کی نسل اتنی نادان نہیں کہ پیٹ بھرنے کے لیے ریت کے سمندر میں بھٹکتی پھرے۔ بات یہ ہوئی کہ ان دنوں میں انڈے دے رہی تھی۔ میرا چڑا اکثر میرے پاس بیٹھا مجھ سے باتیں کرتا رہتا، مجھے تسلیاں دیتا۔ اٹھتے بیٹھتے میرا سہارا بنتا اور سچ کہوں' اس کی چونچ میری چونچ سے مس کرتی تو میرے سارے دکھ درد کافور ہو جاتے۔ مدتوں ہم ایک ہی گھر میں رہے۔ کل اس گھر کا ایک نوجوان کہیں سے ایک چھوکری بیاہ کر لایا اور ہمارے کمرے میں دونوں پلنگ بچھا کر بیٹھ گئے۔ آج صبح میں نے ایک انڈا دیا تھا۔ اس لیے نقاہت سی تھی بدن میں۔ میرا چڑا میرے سر کے بالوں پر چونچ پھیر رہا تھا اور چیخ چیخ کر میرے ارد گرد گھوم گھام کر گاہے گاہے میرا مزاج پوچھ لیتا تھا۔ نیچے فرش پر نئے میاں بیوی راز و نیاز میں مصروف تھے اور بھائی! میں اکثر سوچا کرتی ہوں کہ تم انسانوں کے راز و نیاز کا کوئی وقت تک مقرر نہیں۔ تم اتنے قوی سمجھے جاتے ہو اور عورت کو دیکھ کر تمہاری رگوں میں خون کے بجائے برفیلا پانی تیرنے لگتا ہے۔ ہم چڑیوں کو دیکھو' ہمارے چڑے ہیں۔ دانہ چگتے وقت کبھی تنگ نہ کریں گے۔ ہاں تو ہمارا شور سن کر نئے نئے میاں بیوی بہت سٹپٹائے پہلے تو "شی شی" کرتے رہے جو تم قوی انسانوں کا ہم کمزور چڑیوں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کے خلاف پہلا حربہ ہے۔ دلہن نے کڑے بجائے تالیاں پیٹیں۔ دولہا نے بازو جھٹک جھٹک کر ہمیں ڈرایا۔ میرے چڑے نے کوئی پروا نہ کی تو دولہا اپنا نیا جوتا اتارنے لگا۔ میں چلائی کہ "ادھر کھسک آ' ادھر میرے پہلو میں آجا۔" لیکن وہ وہیں بیٹھا مجھے ایک گیت سناتا رہا۔ پٹاخ سے جوتا ہمارے گھونسلے پر آن گرا اور میرے چڑے کی ایک ٹانگ اور ایک بازو ٹوٹ گیا۔ وہ وہاں سے اڑا اور میں دو انڈوں کو تنکوں تلے چھپاتی اس کے پیچھے ہولی۔ لیکن وہ اس سے قبل میرے نظروں سے غائب ہو چکا تھا۔ سہیلیوں سے پتہ پوچھا تو معلوم ہوا کہ کراہتا ہوا ادھر ویرانے کی طرف جا رہا تھا۔ ایک پر لٹکا ہوا——ایک ٹانگ جھولتی ہوئی۔ خاموش اور بے ہوش۔ جیسے بہت باجرہ چگ لیا ہے! میں نے ادھر کا رخ کیا۔ اڑتے اڑتے پروں نے جواب دے دیا۔ انتڑیاں پہلے سے سوکھی ہوئی تھیں ہانپ گئی۔ تھک گئی اور کھسکتی کھسکتی اس جھاڑی تلے آ گئی۔ لیکن اس بھوبھل میں ننھی سی جان کیسے جی سکوں گی۔ سورج آگ برسا رہا ہے۔ مر جاؤں گی۔ لیکن مرنے سے پہلے ایک بہت لمبی اڑان کی تمنا ہے۔ تم ادھر کہاں آ نکلے۔ یہ راہ گزار تو کہیں ختم ہونے کا نہیں——وہ دور ایک لکیر سی نظر آ رہی ہے نا؟——وہاں ایک آبادی ہے۔" میں نے چھاگل کا منہ کھول کر چلو میں پانی بھرا اور چڑیا کے آگے لے جا کر بولا۔ "لے ذرا حلق تر کر لے اور بتا اب کدھر جائے گی؟"——پانی دیکھ کر اس کی آنکھیں چمک اٹھیں اور میرے چلو میں پروں کو سمیٹتی اور پھیلاتی رہی۔ آنکھیں جھپکا کر بولی۔ "تم انسان ایک دوسرے سے کتنے مختلف ہوتے ہو۔ میں ادھر افق کی طرف جاؤں گی۔ میرا چڑا سیدھا ادھر گیا ہے اور سنا ہے افق پر جنگ ہو رہی ہے۔ گھوڑے کی ٹاپوں تلے آ گیا تو انجر پنجر تک نہ ملے گا۔ میں تو یہاں بھی تلواروں کی جھنکاریں اور تیروں کی سنسناہٹ سنتی ہوں تو جی بیٹھنے لگتا ہے۔ لیکن حضرت انسان۔ میرا چڑا تو مجھے آگ کی بھٹی میں بھی ملے تو میں اس میں کود جاؤں۔"——ایک گیند کی مانند——دور ایک اڑتا ہوا پتہ——ایک بھونرا سا——دھوئیں کا ایک نقطہ

www.iqbalkalmati.blogspot.com

سا ——— اور پھر نظر سے اوجھل ——— گمان سا ہوا اور مٹ گیا۔ اور ویرانے میں بہت دور گھوڑوں کی ہنہناہٹ سپاہیوں کے نعروں' تلواروں کی جھنکاروں کی بہت مدھم گونج کے سوا اور کچھ نہ رہا! ——— کتنی درد مند دنیا ہے! ——— کتنے دکھی ہیں یہاں کے بسنے والے! ——— یہاں دلوں پر کتنے زخم ہیں اور ان زخموں کے لیے مرہم کی کتنی کمی ہے۔ یہ کیسی دنیا ہے! کتنے انوکھے قانون ہیں یہاں ——— قدم قدم پر کتنی ہولناک داستانیں سننے میں آئی ہیں ——— دنیا والوں نے خدا جانے سکھ اور مسرت کے الفاظ کیسے گھڑ لیے ہیں۔ جب کائنات کے چپے چپے پر دکھوں کی بھیانک پرچھائیاں منڈلا رہی ہیں۔ احساسات کے دباؤ نے میری رگوں میں آگ بھر دی۔ مجھے ہر طرف دبی دبی چیخیں سنائی دینے لگیں۔ میں نے سمجھا یہ ایک واہمہ ہے۔ لیکن میرے قدم جتنی تیزی سے اٹھتے چیخیں تیز تر ہوتی جاتیں! میں سرپٹ دوڑنے لگا۔ لیکن میں جیسے التجاؤں اور فریادوں' سسکیوں اور ہچکیوں کے طوفان کی طرف کھنچا چلا جا رہا ہوں۔ ——— آوازیں تیز اور بلند ہوتی گئیں۔ ——— میرا دماغ وحشیانہ سرعت سے گھومنے لگا۔ اور آخر ایک کھنڈر کی دیوار کے پاس جا کر میں ایک جگہ بے جان پتھر کی طرح گرم ریت پر دھپ سے گر پڑا!!

لیکن چیخیں اسی طرح بلند ہو رہی تھیں ——— سلگتی فضا میں ان فریادوں کی لپٹیں بل کھاتی ہوئی افق کے دائرے میں قیامت خیز سرعت سے چکر کاٹ رہی تھیں! ساری کائنات ان چیخوں کی زنجیروں میں جکڑی گئی' میرا دم گھٹنے لگا۔ ——— اچک کر کھنڈر کی ٹوٹی پھوٹی محراب پر چڑھ گیا۔ اندر بڑی بڑی مونچھوں گھنی بھوؤں اور گول توندوں والے دو رئیس ایک خوبصورت دہقانی لڑکی کے بازو پکڑے اسے ننگا کرنے کی کوشش کر رہے تھے! ——— وہ بیچاری بے بس گٹھڑی کی طرح سمٹ سمٹ جاتی تھی۔ اس کا گریبان کھل گیا تھا۔ آستینیں پھٹ چکی تھیں۔ اس کی لمبی لمبی لہراتی زلفیں خاک سے اٹ گئی تھیں

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اور مجھے اس کی ننگی پشت نظر آ رہی تھی۔ جس کی سپید سطح پر ان رئیسوں کے ناخنوں کی لمبی لمبی خراشیں تھیں اور ان سے خون پھوٹ رہا تھا!۔۔۔۔ بجلی کی طرح ابھر کر وہ ان کی گرفت سے نکل نکل جاتی تھی۔ لال لال آنکھوں والے یہ رئیس دوڑتے ہوئی بیل کی طرح نتھوں سے سانسوں کے بگولے نکال کر اسے دبوچ لیتے اور کہتے "اتار دے اپنی انگیا کو۔۔۔۔ اتار ڈال اسے ورنہ تیرا حلق دبا دیں گے"۔۔۔۔ باہر ایک جھاڑی کے پاس بندھے ہوئے دو گھوڑے ہنہناتے اور لڑکی افق کی طرف باہیں بلند کر کے پکارتی۔۔۔۔ "اے جنگ میں لڑنے والے! اے وطن کے ناموس پر قربان ہونے والے آقا!۔۔۔۔ ادھر بھی ایک نظر ڈال کہ جس مادرِ وطن کی حفاظت کے لیے تو نے سر دھڑ کی بازی لگا رکھی ہے اسی کے فرزند میری نسوانیت کا خزانہ لوٹنا چاہتے ہیں۔ اپنے گھوڑے کی لگام ادھر پھیر لے، کہ اپنے گھر کی حفاظت تجھ پر اسی طرح فرض ہے جس طرح اپنے وطن کی! مجھے ان لعینوں سے چھڑا کہ میں تیری بیمار ماں کی آنکھوں پر ہاتھ رکھ سکوں جس کا آخری وقت اب قریب ہو گا!"

اس کی انگیا پھٹ گئی اور وہ گوشت کا ایک سفید لوتھڑا بن کر رئیسوں کے وحشیانہ حملوں کے مقابلے میں فولادی گولے کی طرح لڑھکنے لگی۔ میں بپھرے ہوئے شیر کی طرح کھنڈر میں کود پڑا۔ میں نے اپنے گھونسوں اور لاتوں سے ان دونوں کو زمیں پر بچھا دیا۔ لڑکی کی طرف اپنا چغہ پھینک دیا اور رن پر جانے کی بجائے گھوڑوں پر سوار ہو کر ہم دونوں آبادی کی طرف لوٹ پڑے۔۔۔۔ افق کی طرف گھوڑوں کی ہنہناہٹ، تیروں کی سنسناہٹ اور تلواروں اور ڈھالوں کی کھڑکھڑاہٹ تیز ہو گئی۔ سپاہیوں کے نعرے بلند ہونے لگے۔ لیکن وطن کی آن پر کٹ مرنے کی بجائے میں نے ایک ایسی لڑکی کے ناموس کی نگہبانی کو افضل سمجھا جس نے اپنی عصمت کی حفاظت کے لیے دو ڈاکوؤں کا جان توڑ مقابلہ کیا تھا!

آخر آزاد خواب تو دیکھ سکتا ہے نا ایک غلام!

✽ ✽ ✽

www.iqbalkalmati.blogspot.com

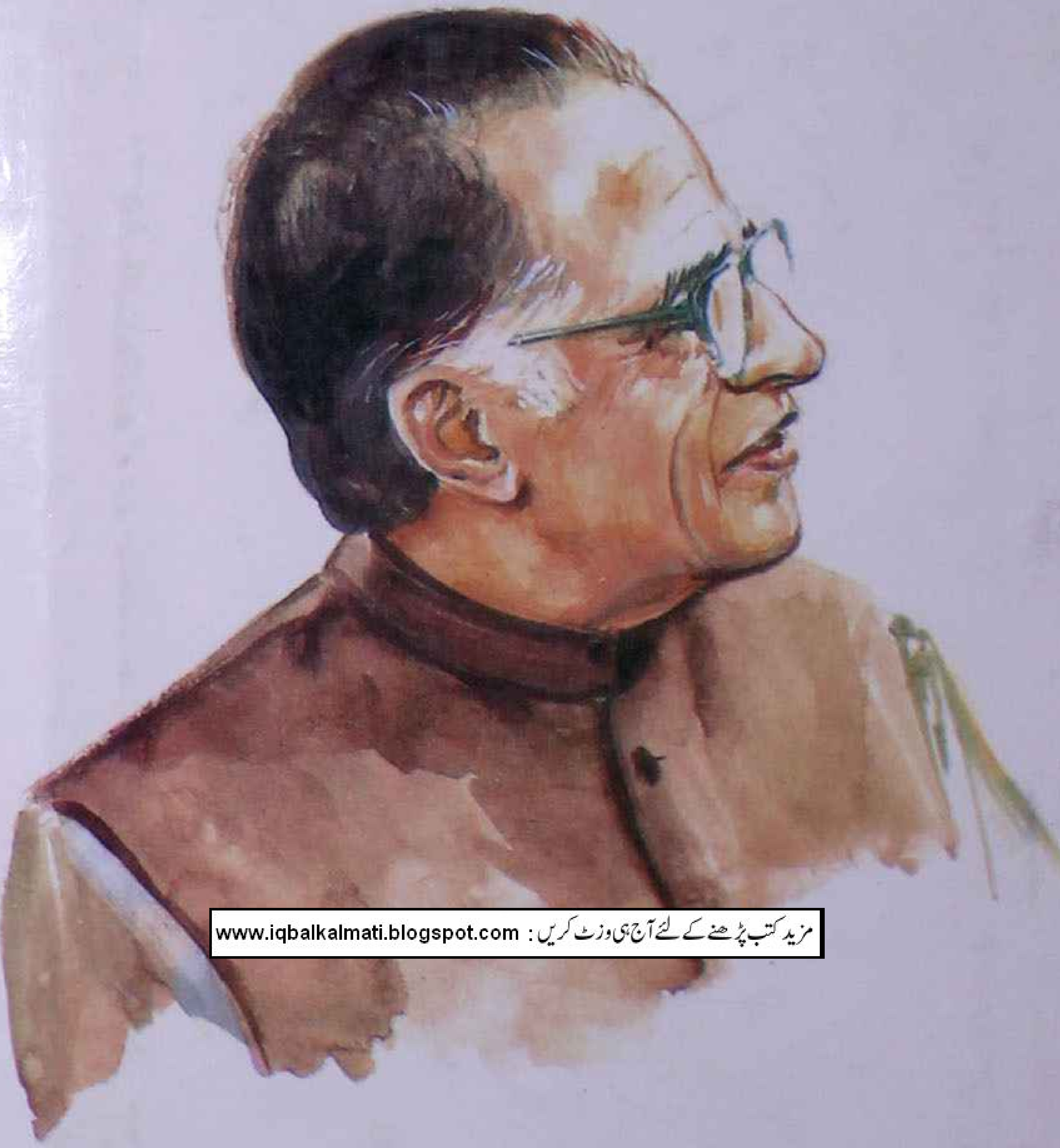

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

اساطیر
لاہور